اردو کے
منتخب انشائیے
(۱۹۹۱ء تا ۲۰۱۶ء)
مرتب
خالد صدیقی
اکادمی ادبیات پاکستان

اردو کے منتخب انشائیے

(۱۹۹۱ء تا ۲۰۱۶ء)

مرتب

خالد صدیقی

اکادمی ادبیات پاکستان

پطرس بخاری روڈ، اسلام آباد

نگرانِ اعلیٰ	ڈاکٹر محمد قاسم بگھیو
منتظم	ڈاکٹر راشد حمید
مرتب	خالد صدیقی
تدوین	اختر رضا سلیمی
طباعت	علی یاسر
ٹائٹل	سجاد احمد
تعدادِ کتب	1000
سنِ اشاعت	2018
مطبع	NUST پریس، اسلام آباد
قیمت	200 روپے -

ISBN: 978-969-472-441-6

Selected Light Essays of Urdu

(1991-2016)

Compiled By
Khalid Siddiqi

Publisher
Pakistan Academy of Letters
Pitras Bukhari Road.
Sector H-8/1, Islamabad.
Email: ar.saleemipal@gmail.com, Website: www.pal.gov.pk
Ph: +92-51-9269714, Fax: +92-51-9269719

فہرست

حرف آغاز

''منتخب اردو انشایئے'' ۱۹۹۱ء تا ۲۰۱۶ء کے درمیانی عرصے میں لکھے گئے انشائیوں کا انتخاب ہے۔ اس سے قبل اکادمی ادبیات پاکستان ۱۹۹۰ء میں ممتاز شاعر اور ادیب اکبر حمیدی کا مرتب کردہ انتخاب شائع کر چکی ہے، جسے بے حد سراہا گیا تھا۔

اگر چہ قدیم اردو تحریروں میں بھی انشائی عناصر ملتے ہیں تاہم اردو میں باقاعدہ ایک صنف کے طور پر انشایئے نے ستر کی دہائی میں اپنے خدوخال واضع کیے اور مختلف رسائل و جرائد تواتر سے شائع ہونے کے ساتھ ساتھ علاحدہ سے مجموعوں کی صورت میں منظر عام پر آنے لگے۔

اسی اور نوے کی دہائی میں تو اس حوالے سے باقاعدہ بحثیں ہونے لگیں اور انشایئے کی تنقید کے حوالے سے کئی تنقیدی کتب شائع ہوئیں، جن میں ہمیں معاصرانہ چشمکیں بھی ملتی ہیں لیکن یہ معاصرانہ چشمکیں زیادہ عرصہ نہ چل سکیں اور اب تقریباً تمام نقاد انشایئے کو ایک اہم اردو صنف کے طور پر قبول کر چکے ہیں۔

زیرِنظر مجموعے میں کل انتالیس انشایئے منتخب کیے گئے ہیں اور یہ سب کے سب ۱۹۹۱ء کے بعد مختلف رسائل میں شائع ہونے والے انشائیوں سے منتخب کیے گئے ہیں۔

اس کتاب کے مرتب جناب خالد صدیقی مزاح نگاری کے ساتھ ساتھ انشائیہ نگار بھی ہیں۔ان کے انشایئے مختلف ادبی رسائل و جرائد میں شائع ہوتے رہے۔اس علمی تعاون کے لیے ہم ان کے ممنون ہیں اس انتخاب پر نظر ثانی ممتاز شاعر اور ادیب ڈاکٹر توصیف تبسم نے کی ہے اور انھوں نے بہت سے مفید مشوروں سے نوازا، جس کے لیے ہم ان کے شکر گزار ہیں۔

اس کتاب کی فنی تدوین، تزئین اور آرائش کے لیے میں ممتاز ناول نگار، شاعر اور ادارے کے مدیر جناب اختر رضا سلیمی کا بھی شکریہ ادا کرتا ہوں۔

مجھے امید ہے کہ انشائیے سے دلچسپی رکھنے والے حضرات کے علاوہ عام ادبی قارئین کے لیے بھی یہ کتاب ایک رہنما کتاب ثابت ہوگی۔

ڈاکٹر محمد قاسم بگھیو

دیباچہ

مغرب میں انشائیے کی جو روایت مونتین اور بیکن نے قائم کی تھی، وہ وقت کے ساتھ ساتھ نسل در نسل آگے بڑھتی رہی ہے۔ گزشتہ صدی کی ساٹھ کی دہائی میں اردو انشائیے کا فروغ، اور بطورِ تحریک، اس کی پیش قدمی اس حقیقت کی غماز ہے کہ اردو انشائیے کو آج تک جو فروغ حاصل ہوا، وہ سب ڈاکٹر وزیر آغا کی مساعی کا نتیجہ ہے، جنھوں نے انشائیے کو پہلی مرتبہ اردو ادب میں ایک علاحدہ صنفِ نثر کے طور پر متعارف کرایا۔ ۱۹۶۱ء میں اُن کے انشائیوں کا پہلا مجموعہ ''خیال پارے'' کے نام سے منظرِ عام پر آیا تو ادبا کی ایک بڑی تعداد نے اس کے خدوخال اور اسلوب کو اشتیاق کی نگاہوں سے دیکھا اور فکر و نظر کے ایک مؤثر وسیلے کے طور پر قبول کیا اور اس کے فروغ اور ارتقا کے لیے اُن کے ہم سفر ہو گئے۔ مجلّہ ''اوراق'' نے بھی اس سلسلے میں بہت تعاون کیا تا کہ انشائیہ اپنا سفر کامیابی سے جاری رکھ سکے۔

انشائیے کے بارے میں ڈاکٹر وزیر آغا کی وضع کردہ تعریف کچھ یوں ہے:

> ''انشائیہ اُس نثری صنف کا نام ہے جس میں انشائیہ نگار اسلوب کی تازہ کاری کا مظاہرہ کرتے ہوئے اشیا یا مظاہر کے مخفی مفاہیم کو کچھ اس طور گرفت میں لیتا ہے کہ انسانی شعور اپنے مدار سے ایک قدم باہر آ کر ایک نئے مدار کو وجود میں لانے میں کامیاب ہو جاتا ہے۔''

(بحوالہ ''انشائیہ اردو ادب میں'' از ڈاکٹر انور سدید، ص ۳۹)

ڈاکٹر وزیر آغا اس تعریف کی مزید وضاحت کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ''انشائیہ دُوسرے کنارے سے پہلے کنارے کو دیکھنے کا ایک زاویہ ہے مگر یہ دُوسرے کنارے سے لطف اندوز ہونا بھی جانتا ہے۔ انشائیہ بیک وقت اسلوب کا نیا پیرایہ بھی ہے اور دیکھنے کا ایک نیا زاویہ بھی۔''

(بحوالہ ''انشائیہ اردو ادب میں'' از ڈاکٹر انور سدید، ص ۴۰/۴۱)

اردو انشائیے کا سفر اتنا آسان نہیں تھا۔ اس پر شائع ہونے والے گراں قدر تنقیدی مضامین اور تحقیقی مقالوں نے انشائیہ فہمی کی تحریک کو جلا بخشی۔ اس کی فنی شناخت، مزاج شناسی اور پہچان کی راہ میں ہر مزاحیہ، طنزیہ، فکاہی اور اصلاحی تحریر انشائیے کی نیم پلیٹ کے دروازے پر دستک دے رہی تھی اور خود کو انشائیہ کہلانے پر مُصر تھی جب کہ انشائیہ اپنے فنی اسلوب، تازہ کاری، لطافت و نزاکتِ زبان، بیان و مفاہیم کی ندرت، غور و فکر کی گہرائی اور انفرادی سوچ کے ساتھ اپنی پہچان کی راہ ہموار کرتے ہوئے اعتماد کے ساتھ چہل قدمی کرتا ہوا نظر آتا تھا...... کبھی چاندنی رات کے سحر میں کھو کر چاند سے ناتا جوڑ لیتا تو کبھی روڈ رولر پر سوار ہو کر نئے ابعاد اور تازہ مناظر کا احساس دِلاتا؛ کبھی تاروں بھری رات کے کشف و کرامات دیکھتا تو کبھی دُھند کی دُودھیا سکرین پر قد و قامت والی اشیا کو رقص کرتے دیکھتا؛ کبھی سائیکل پر سوار، نئی دُنیا میں تلاش کرنے نکل پڑتا تو کبھی کسی گاڑی کی فرنٹ سیٹ پر بیٹھ کر باہر کے مناظر کو نئے زاویے سے دیکھتا اور لطف اندوز ہوتا؛ کبھی برگد کے درخت کی بزرگی سے لوریاں لینے لگتا تو کبھی درمیان کی دیوار کے دونوں رُخوں سے پردہ اُٹھاتا؛ کبھی حاشیے کی پُراسراریت کے بارے میں انکشاف کرتے ہوئے سبزہ زاروں میں مست ہرنی کی طرح کلیلیں بھرتا تو کبھی کائنات اُسے نئی نویلی دُلھن کی طرح سنگار کرتے دکھائی دیتی؛ اور پھر شخصی سوچ، جداگانہ زاویہ نگاہ، خیال افروزی اور مزاج آفرینی کی خوبصورتی سمیت فکر و نظر کی تازہ بستیاں آباد کرتا چلا گیا۔ نتیجہ یہ کہ نئے پرانے لکھنے والے انشائیے کی طرف یوں راغب ہوتے چلے گئے کہ یکے بعد دیگرے انشائیہ نگاروں کی کہکشائیں وجود میں آتی چلی گئیں، جن کی جلو میں انشائیے کا سفر تابناک اور صحت مند فضاؤں میں آگے ہی آگے بڑھتا گیا۔

سولھویں صدی کے آخر میں انشائیہ یعنی Essay نے جب فرانسیسی ادیب مونتین کی وساطت سے ایک مربوط اور علاحدہ صنف کے طور پر اپنی پہچان کرائی تو اس نئی صنفِ ادب کو خوب سراہا گیا کیوں کہ مونتین نے اس کے نقوش کو اظہار کی دُوسری اصناف میں ضم نہیں ہونے دیا تھا۔ مونتین سے قبل اس کی باقاعدہ صورت دریافت نہیں ہو سکی تھی؛ اس بنا پر مونتین کو انشائیے یعنی Essay کا بانی تسلیم کیا گیا۔ ڈاکٹر انور سدید نے اپنی کتاب ''انشائیہ اردو ادب میں، ص ۴۷۔۴۳'' میں حوالہ دیا ہے کہ:

> ''جب مونتین اہلِ جہاں سے اُکتا گیا تو اُس نے اپنے گاؤں کے ایک کونے میں پناہ حاصل کر لی؛ دلچسپ بات یہ ہے کہ گاؤں کی اس معطر تنہائی میں اُس کی ملاقات اپنے اندر کے انشائیہ نگار سے ہوئی اور اُس نے مونتین کو بے نقاب کرنا شروع کر دیا......

مونتین کے انشایئے یعنی Essays محض اُس کی تحریریں ہی نہیں' مونتین کی ذات کا عکس بھی ہیں۔''

گویا مونتین کے Essays انکشافِ ذات کا مظہر ہیں جن میں ایک خالص انشائیہ نگار نظر آتا ہے۔ انگریزی ادب نے انگلستان میں مونتین کے Essays کے تراجم سے اکتسابِ فیض کیا۔ فرانسس بیکن نے بھی' جو مونتین کا ہم عصر تھا' مونتین کے Essays کا بغور مطالعہ کیا اور اس صنفِ ادب کو اپنایا کیوں کہ اُسے مونتین کے Essays میں علم و دانش کے سوتے پھوٹتے نظر آئے تھے۔

سترھویں صدی میں ابراہم کاؤلے نے انشایئے کو انکشافِ ذات کی راہ پر ڈال کر اس کے اصل مزاج کی تجدید کر دی۔ اٹھارھویں صدی میں رچرڈ سٹیل اور جوزف ایڈیسن نے پیریاڈیکل انشایئے تخلیق کر کے ایک نئے باب کا اضافہ کیا۔ ہیزلٹ نے لکھا ہے کہ:

''اُس دور میں پیریاڈیکل انشائیہ نگاروں نے سامنے کی اشیا' مظاہر اور واقعات پر بلا جھجک آزادہ روی سے اظہارِ خیال کا سلسلہ شروع کر دیا...... طنز و مزاح کے لبادے میں زندگی کے ان فلاسفہ نے وقت کے اہم مسائل پر کمندیں ڈالیں اور قاری کے سامنے فکر و خیال کا نیا مواد یوں پیش کر دیا جیسے ایک ماہرِ نباتات نئے پودے اور شاخیں تلاش کر لاتا ہے یا ایک ماہرِ معدنیات پہاڑ کی کوکھ سے نئے ہیرے برآمد کر لیتا ہے' تاکہ ان کی مدد سے ایسے نظریات کی توثیق ہو سکے جو انسانیت کے لیے مفید ہوں۔''

(بحوالہ ''انشائیہ اردو ادب میں'' از ڈاکٹر انور سدید' ص ۱۲۸/۱۲۹)

چارلس لیمب' ولیم ہیزلٹ' لے ہنٹ' آر ایل سٹیونسن وغیرہ اُنیسویں صدی کے نام ور انشائیہ نگار یعنی Essayists تھے۔ اُن کے Essays کے موضوع روزمرہ کے مشاہدوں' تجربوں اور سوچوں پر مبنی تھے جن میں مونتین کی طرح اشیا اور مظاہر کے پرتو میں داخلیت کی روح نظر آتی ہے۔ سٹیونسن نے ''کاہلوں کی وکالت میں''، لیمب نے ''کنواروں کا شکوہ'' اور ہیزلٹ نے ''سیر و سفر'' کے عنوان سے خوبصورت انشایئے یعنی Essays لکھے۔ یہ وہ جواہر پارے ہیں جو انگریزی ادب کا سرمایۂ افتخار ہیں۔ علاوہ ازیں لیمب اور ہیزلٹ نے انشائیہ یعنی عام Essay کو Personal Essay کے منفرد نقوش میں ڈھال کر اس کی داخلی رُوح کو منور کیا۔

انگریزی انشائیہ بیسویں صدی میں مقبولیت کی انتہا پر رہا جس کے مصنفین میں جی کے چسٹرٹن'

میکس بیر بھوم، ورجینیا وولف، پریسٹلے، رابرٹ لنڈ اور دُوسرے اعلیٰ پائے کے انشائیہ نگاروں کے نام شامل ہیں۔ ان سب کے انشائیوں میں تحریر کے وصف کی وہی روایت ملتی ہے جو مونتین اور بیکن نے قائم کی تھی۔

اردو ادب میں جب نئے خیالات اور تجربات کی وجہ سے مروجہ اصناف میں ہیئت کی تبدیلیاں رُونما ہوئیں تو انشائیہ جیسی نئی صنفِ ادب کا بھی آغاز ہوگیا۔ ہر چند کہ خیال کی نزاکت، زبان کی سلاست اور احساس کی بلاغت اس نے شاعری سے حاصل کی اور ظاہری خدو خال، رنگ رُوپ، معنی آفرینی، جزئیات نگاری اور بات کو کہانی کے انداز میں کہنے کا ڈھنگ فکشن سے لیا؛ تاہم انشائیہ فکشن اور شاعری سے دُور رہا کیوں کہ اس کا اسلوب اپنا تھا اور اس نے طنز و مزاح کا سایہ خود پر بالکل نہ پڑنے دیا اور اس کی ہیئت کی سطح نئی اور اپنی تھی۔ غلام جیلانی اصغر کے مطابق:

''مزاج کے لحاظ سے غزل اور انشائیے میں کوئی فرق نہیں؛ لیکن ہیئت کے لحاظ سے یہ دونوں اصناف جداگانہ خاصیتوں کی حامل ہیں۔''

(بحوالہ ''انشائیہ ایک ہمہ جہت صنفِ نثر'' از سلیم آغا قزلباش، مشمولہ 'اوراق' اپریل رمئی ۱۹۸۵ء، ص ۱۴۱)

ڈاکٹر سلیم اختر لکھتے ہیں:

''صرف انشائیہ ہی خالص نثری صنف ہے ورنہ کہانی اور ڈراما تک بھی کچھ منظوم ہوسکتا ہے۔ اچھی نثر کے بغیر انشائیے کا تصور بھی نہیں کیا جاسکتا۔''

(بحوالہ ''انشائیہ ایک ہمہ جہت صنفِ نثر'' از سلیم آغا قزلباش، مشمولہ 'اوراق' اپریل رمئی ۱۹۸۵ء، ص ۱۴۲)

چناں چہ کہا جاسکتا ہے کہ انشائیہ ہی وہ صنفِ ادب ہے جو آج کے انٹیلکٹ کے اظہار کی خاطر وجود میں آئی اور جس نے نیا خیال، نیا تجربہ، نیا مشاہدہ، نیا جذبہ اور نئی کیفیت اپنی پہچان کی بنیاد بنائی۔

اردو انشائیہ اپنے مکمل رنگ رُوپ میں اُجاگر ہونے سے پہلے (بیسویں صدی کے ساٹھ کے عشرے تک) منتشر حالت میں اردو نثر میں موجود تھا؛ مگر اپنی مکمل شناخت اور نام سے بہت دُور تھا؛ تاہم یہ قاری کے ادبی ذوق کی تسکین کے نزدیک تھا۔ اس طرزِ تحریر کا مزاج سرسید اور کچھ دیگر ادبا کے ہاں جزوی طور پر موجود نظر آتا ہے۔ سرسید نے ایڈیسن اور سٹیل کی پیروی میں مضامین لکھنے کا آغاز کیا اور رسالہ ''تہذیب الاخلاق'' کے اجرا کی طرف متوجہ ہوئے۔ اُن کے مضامین مقصدی اور اصلاحی تناظر کے آئینہ دار تھے، اس لیے اُن کا طرزِ تحریر موجودہ انشائیے کے اسلوب کی روح اور خوشبو سے دُور ہو جاتا ہے۔ اُس دور کی تحریروں میں کہیں کہیں انشائیے کی جھلکیاں تو دیکھی جاسکتی ہیں؛ مگر انشائیہ اپنی مکمل تصویر

کشی نہیں کرتا۔ جدید دور کے فن کار کی دُوررس نگاہوں نے اُن تحریروں کی اس کیفیت کو بھانپا اور تحریر کو جزو کی کیفیت سے نکال کر مکمل تحریر کے سانچے میں ڈھالا' اور اس عمل میں اُن کے اندر کا انشائیہ نگار برآمد ہوا جس نے تحریر کو واقعات اور رفتار کے بہاؤ کے ساتھ نئی صورت عطا کر دی۔ اس نوع کی نئی اور مثالی تحریروں کو رسالہ ''ادبِ لطیف'' نے ''خیال پارے''، ''لطیف پارے''، ''انشائے لطیف'' کے عنوانات کے تحت شائع کیا اور بعد میں ''انشائیہ'' کے نام سے موسوم کیا تو ادب سے وابستہ لوگوں میں یہ نام مقبول ہو گیا اور ڈاکٹر وزیر آغا کے انشائیوں کے پہلے مجموعے ''خیال پارے'' کی اشاعت کے ساتھ ہی اس کے ارتقا کا دور شروع ہو گیا؛ گویا ۱۹۶۱ء وہ سال ہے جب انشائیے نے پاکستان میں جنم لیا اور یہ خالص پاکستانی صنفِ ادب کہلایا...... یہی دور جدید انشائیہ نگاری کا دور کہلاتا ہے۔ اس دور میں ڈاکٹر وزیر آغا کے ساتھ غلام جیلانی اصغر' مشتاق قمر' جمیل آذر اور ڈاکٹر انور سدید شامل ہوئے؛ بعد میں اس کہکشاں میں سلیم آغا قزلباش' اکبر حمیدی' انجم نیازی' بشیر سیفی' خیر الدین انصاری' حامد برگی' خالد صدیقی' پروین طارق' ڈاکٹر ناصر عباس نیر' حنیف باوا' مشتاق احمد اور بہت سے دُوسرے ادیب اور شاعر شامل ہوئے۔ ان انشائیہ نگاروں نے اپنے انشائیوں میں داخل سے خارج کا سفر اپنی بہترین تخلیقی صلاحیتوں کو بروئے کار لاتے ہوئے طے کیا اور ایسے موضوعات پر بھی انشائیے تخلیق کیے جو روزمرہ زندگی کے حوالے سے عام نوعیت کے حامل تھے اور عام نظروں کی توجہ سے دُور تھے۔ انشائیہ نگار کی عمیق نظریں اُن موضوعات کی گہرائی میں اُتر گئیں اور اُس نے داخلی سفر کے شخصی تجربے سے گزرتے ہوئے متعجب پہلوؤں کا انکشاف کیا اور اُن عام سے موضوعات کو اہم درجے پر لا کھڑا کیا اور قاری کو اپنا ہم خیال اور ہم نوا بناتے ہوئے مسرت سے ہم کنار کیا۔ اس حوالے سے چند انشائیوں کے نام بطور ثبوت درجِ ذیل ہیں:

ریلوے ٹائم ٹیبل' چھکڑا' لحاف (ڈاکٹر وزیر آغا)' بچہ پالنا' بستر میں لیٹنا (غلام جیلانی اصغر)' دُھوپ کھانا' کچھ نیند کی مذمت میں (مشتاق قمر)' منی پلانٹ' مانگے کی سگریٹ (جمیل آذر)' مچھر کی مدافعت میں' غلطی کرنا (ڈاکٹر انور سدید)' کان (سلیم آغا)' ریلوے پھاٹک (اکبر حمیدی)' ناک (انجم نیازی)' نکٹائی (بشیر سیفی)' قاری (خیر الدین انصاری)' چھپکلی (حامد برگی)' زیرو پوائنٹ (خالد صدیقی)' دوپٹا (پروین طارق)' تانگہ (ناصر عباس نیر)' مچھر دانی (حنیف باوا)' دُکھ (مشتاق احمد) وغیرہ۔

''اوراق'' کے انشائیہ نمبر (اپریل رمئی ۱۹۸۵ء) نے چند انگریزی انشائیوں کے اردو تراجم

شائع کر کے قاری کو انگریزی انشائیے کے مزاج سے آشنا کیا تا کہ وہ اندازہ کر سکے کہ اردو انشائیہ مزاج کے لحاظ سے انگریزی انشائیے سے کس حد تک مختلف اور معیار کے اعتبار سے کہاں کھڑا تھا!

اردو انشائیہ بیسویں صدی کے آخری چالیس سال کا سفر اعتماد کے ساتھ طے کرتے ہوئے ہراول دستے سمیت نئے چہروں کو متعارف کراتے ہوئے اکیسویں صدی میں عزت و وقار کے ساتھ داخل ہوا۔ نئے انشائیہ نگاروں میں منور عثمانی، شفیع ہمدم، عبدالقیوم، شاہد شیدائی، محمد عامر رانا، بصیر رضا، عامر عبداللہ، سید تحسین گیلانی، ڈاکٹر محبوب عالم، ساجدہ نواز، روبی جعفری، ڈاکٹر محمد سلیم ملک، ظہیر عباس، فاطمہ بتول اور انتظار باقی کے علاوہ کئی دوسرے فن کار شامل ہوئے۔ ان انشائیہ نگاروں نے تسلسل کے ساتھ انشائیے قلم بند کر کے اس کے ساتھ اپنے ذہنی، قلبی اور فنی لگاؤ کا ثبوت دیا جو اس بات کا مظہر ہے کہ انشائیہ اپنے ارتقا کی جانب رواں دواں ہے۔ جوں جوں دُنیا ایک عالمی گاؤں کی شکل میں ڈھلتی جا رہی ہے، انشائیے کی مقبولیت اور فروغ میں اضافہ ہوتا جا رہا ہے۔ انشائیہ کالجوں اور یونیورسٹیوں کے اساتذہ اور طلبا میں اس قدر مقبول ہو چکا ہے کہ اس پر ایم اے، ایم فل اور پی ایچ ڈی کی سطح کے تحقیقی مقالے لکھے گئے اور لکھے جا رہے ہیں۔ بے شمار تنقیدی مضامین و کتب اور انشائی مجموعے منظر عام پر آئے۔ متنوع موضوعات پر ادبی مجلوں میں اردو انشائیوں اور انگریزی انشائیے کے تراجم کی اشاعت ہوئی۔ انگریزی اخبارات میں اردو انشائیے کے حوالے سے مضامین لکھے گئے۔ علاوہ ازیں اخبارات کے ادبی ایڈیشن بھی انشائیے کو نمایاں جگہ دیتے ہیں اور انشائیہ ادبی تنقیدی نشستوں میں بھی پڑھا اور سنا جاتا ہے اور معیاری تنقید بھی سمیٹتا ہے۔ انشائیہ اپنی فنی خصوصیات اور عمدہ اسلوب کی وجہ سے اس قدر مقبول ہو چکا ہے کہ اب پاکستان کے علاوہ بیرونی ممالک میں بھی لکھا، پڑھا اور سمجھا جاتا ہے اور اس پر تحقیقی کام بھی ہو رہا ہے۔ خوش آئند بات یہ ہے کہ انشائیہ ایک نسل سے دوسری اور پھر تیسری نسل کو منتقل ہو رہا ہے۔ چناں چہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ انشائیہ اپنے اختصار، داخلی زرخیزی، سادگی، جدت طرازی کے بل بوتے پر اپنا وجود برقرار رکھے ہوئے ہے۔ اس لحاظ سے مستقبل انشائیے کے نام سے منسوب ہوتا نظر آ رہا ہے کیوں کہ یہ فرد کو انبوہ سے نکال کر ایک الگ پہچان عطا کرتا ہے۔

انشائیہ نئے امکانات کی طرف پیش قدمی بھی کرتا ہے۔ یوں الفاظ و معنی ایک نئے آہنگ کے ساتھ مسکراتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ فکر کی گہرائی کو بصیرت کی آنکھ سے دیکھنے کا سلیقہ اور اسے اپنے الفاظ میں برتنے کے حسن کا پورٹریٹ وہی فن کار بنا سکتا ہے جس کی آنکھ آرٹ کی باریکیوں سے واقف ہو اور

جس کے اندر صبر کا ایک خاص پیمانہ موجود ہو اور وہ مہاتما بدھ کی طرح مراقبے یا گیان میں ڈوبتا جاتا ہو۔ اس لحاظ سے انشائیہ وہ صنفِ ادب ہے جو قاری کو سوچ کے عمل سے مسلسل گزارتی ہے اور موضوع کے اعتبار سے اردگرد کے مظاہر کے نئے پرت اور زاویے قاری کے سامنے لاتی ہے۔ قاری جس قدر سوچ کے عمل سے گزرتا ہے، مظاہرِ زندگی اپنے نئے معنی کے ساتھ اُس کے سامنے آتے چلے جاتے ہیں اور اُن کی اوٹ سے انشائیہ زیرِ لب یوں مسکراتا ہوا نظر آتا ہے کہ قاری چند لمحوں کے لیے زمانے بھر کی تلخیوں سے نکل کر خود بھی زیرِ لب مسکرانے لگتا ہے اور تصور ہی تصور میں ایک دل نواز کیفیت سے سرور حاصل کرتا ہے جس میں اُسے ایسے معنی نظر آنے لگتے ہیں جو اس سے پہلے اُس کی نظروں سے اوجھل تھے۔ اس مشاہدے، احساس اور تجربے کو ایک خاص ڈھنگ اور سلیقے سے معنی خیز الفاظ کا لباس پہنا دیں تو انشائیہ خود بخود تخلیق ہونے لگتا ہے اور خیالات کے بطن سے وجود میں آتے ہی اُس کا ہنستا مسکراتا شرماتا ہوا قدرتی روپ سامنے آ جاتا ہے۔

ہر منظر کے پیچھے ایک اور منظر بھی چھپا ہوتا ہے جسے دیکھنے کے لیے انشائیہ نگار کے اندر ایک باطنی آنکھ بھی ہونی چاہیے۔ چناں چہ انشائیہ نگار کے لیے ضروری ہے کہ وہ حساس طبیعت کا مالک ہو، فنونِ لطیفہ کی نزاکتوں اور مظاہرِ زندگی کا مطالعہ و مشاہدہ کرنے کا ذوق رکھتا ہو، روزمرہ زندگی میں عام بول چال کی زبان میں الفاظ کی صحت، اُن کے چناؤ اور اُن کی معنویت کا ادراک رکھتا ہو اور سلجھے ہوئے مزاج کا حامل ہو نیز اُس میں نرمی، شائستگی اور لچک کا خاص رجحان موجود ہو۔

اس باب میں ڈاکٹر وزیر آغا کہتے ہیں:

"انشائیے کا کام یہ ہے کہ وہ سوچ کے لیے غذا مہیا کرنے، شے میں مضمر مخفی مفہوم کو سامنے لانے، معنی آفرینی کے عمل کو جنبش دے۔ البتہ اس کے لیے مقالات کی طرح دلائل و براہین سے کام نہ لے۔ انشائیے میں سوچ قطعاً پرسش نوعیت کی ہوتی ہے اور بنیادی طور پر معنی آفرینی ہی میں اجاگر ہوتی ہے۔"

(بحوالہ "کچھ انشائیے کے بارے میں" از [illegible]، مشمولہ "اوراق" اپریل مئی ۱۹۸۵ء، ص ۱۳۰)

ایک اچھا انشائیہ نگار اپنی تحریر پر جب نگاہِ غائرانہ ڈالتا ہے تو موضوع کی لطافت اُس پر آشکار ہو جاتی ہے اور جوں ہی اُس کی ذات موضوع میں شمولیت اختیار کرتی ہے، اُس کے انشائی سفر کا آغاز ہو جاتا ہے اور پھر جب وہ اپنی ذات کے حوالے سے آگے کی طرف بڑھتا ہے تو اُس کے اردگرد کے منظر

اُسے سوچ اور مشاہدے میں جکڑ لیتے ہیں اور وہ اعماق میں اُتر کر موضوع سے وابستہ نئے نئے مظاہر کی بازآفرینی میں مشغول ہو جاتا ہے۔

انشائیہ طنز و مزاح، لطیفہ گوئی، جملے بازی اور یاوہ گوئی سے پرِتحریر کو خود میں سمونے سے باز رہتا ہے۔ گویا یہ اظہار کا ایک ایسا ذریعہ ہے جو معمولی بات میں غیر معمولی پن کو سامنے لا کر خوشی اور حیرانی کے ملے جلے احساسات سے قاری کو حظ اُٹھانے پر مجبور کر دیتا ہے۔

۱۹۹۱ء سے ۲۰۱۶ء کے دوران پاکستان میں شائع ہونے والے اردو انشائیوں کے اس انتخاب میں شامل ہر انشائیہ موضوع، ہیئت، تازگی، شگفتگی اور خوش نما اسلوب کے اعتبار سے ایک انوکھی کیفیت لیے ہوئے ہے، جس کے باطن سے لیمب، ہیزلٹ اور رابرٹ لنڈ کے انشائیوں کی روایت زندہ نظر آتی ہے، مزید برآں ان انشائیوں میں بالغ نظری، زندگی کا وسیع تجربہ، فکر و خیال کی پختگی، بلوغت، ژرف نگاہی، خیال آفرینی، نکتہ رسی اور نُدرتِ فکر و نظر کی روانی محسوس ہوتی ہے۔ مطالعے سے یہ بات عیاں ہوتی ہے کہ اردو انشائیے کے پیکر میں مقامی آب و ہوا اور تہذیب و ثقافت اس طرح رچ بس گئی ہے کہ آج یہ اپنے ارتقا کے لحاظ سے مغربی انشائیے یعنی Essay سے آگے نکلتا ہوا نظر آتا ہے اور یہ کہ اردو انشائیے نے اپنے آپ کو منوالیا ہے کہ وہ اردو ادب کی رگِ جاں ہے۔

آج کے نئے دور کا انسان اپنے سے باہر ہی نہیں اپنے اندر بھی ایک زندگی بسر کر رہا ہے۔ یہ اندر کی زندگی ہی اُس کے تحفظ کی ضامن ہے جو اُسے زندگی کا فلسفہ عطا کرتی ہے اور فکر کے چراغ روشن کرتی ہے۔ اس لیے فکری زندگی کی توانائی اور بقا کے لیے انشائیہ آج کے دور کی ضرورت ہے۔

خالد صدیقی

ڈاکٹر وزیر آغا

دنیا خوبصورت ہے

یہ آج سے کم و بیش نصف صدی پہلے کا واقعہ ہے!۔۔۔۔رات تاریک تھی اور سرد! میرے کمرے میں لیمپ جل رہا تھا اور ایک طرف دن بھر کا تھکا ہارا ریڈیو چُپ چاپ مضمحل سا پڑا تھا جسے اپنے ہی افکار کے بوجھ تلے اس قدر بے بس ہو کہ اگر اُسے مزید چند لمحوں تک بولنے کا اذن نہ ملا تو شاید اُس کی زبان ہمیشہ ہمیشہ کے لیے گنگ ہو کر رہ جائے گی۔۔۔۔لیمپ جل رہا تھا، رات تاریک تھی اور ریڈیو چُپ اور تنہا! اُس وقت نجانے مجھے کیا ہوا کہ میں نے اُٹھ کر کمرے کی کھڑکی کھول دی جس کا رُخ مشرق کی طرف تھا اور جس میں سے دن کو درخت اور دُور دُور تک بچھے ہوئے ہرے بھرے کھیت نظر آیا کرتے تھے۔تب میں نے لیمپ بجھا دیا اور تاریکی جو کمرے کے باہر رُکی کھڑی تھی، چشم زدن میں لپک کر اندر آ گئی اور پھر کمرے کی ہر شے پر مسلط ہو گئی۔ پھر میں نے ریڈیو کھول دیا اور نغمے کی ایک لطیف اور پُر اسرار سی لَے میری سماعت کو آہستہ آہستہ سہلانے لگی۔ میں اپنے پلنگ پر دراز ہو گیا۔ اس طور کے کھلی ہوئی کھڑکی میرے روبرو تھی اور درختوں کے ہیکل مجھے اپنی موہوم سی جھلک دکھا رہے تھے۔ اب تاریکی تھی، نغمے کا لطیف سُر تھا اور چاروں طرف ٹھٹھکی ہوئی خاموشی! اور تب یکا یک درختوں اور کھیتوں کے پار مشرقی افق پر ایک ہلکی سی روشنی نمودار ہوئی اور بدلیوں کے کنارے دودھیا ہو گئے۔ پھر آہستہ آہستہ جیسے بین کے طلسماتی اثر سے مدہوش سولہویں رات کے چاند نے بادلوں کی پٹاری میں سے اپنا سر ذرا سا باہر نکالا۔ درخت کچھ اور نمایاں ہو گئے، بدلیاں کچھ اور دودھیا ہو گئیں، نغمہ کچھ اور میٹھا ہو گیا اور کائنات کی حسینہ نے ایک بھرپور انگڑائی لے کر ایسی مخمور نگاہوں سے میری طرف دیکھا کہ فرطِ مسرت سے میری آنکھیں بھیگ گئیں۔ میں نے سوچا یہ زندگی ہزار بدنما اور داغدار سہی، انسان ہزار سنگ دل اور بے مروت اور نظامِ عالم ہزار پرانا اور پامال سہی، قدرت آج بھی کمال فراخدلی سے اپنے حسن کی تجوریوں کو کھولے ہوئے ہے اور ہمیں ان سے مٹھیاں بھر لینے کی ترغیب دے رہی ہے مگر ہم ہیں کہ اپنی چھوٹی چھوٹی دشمنیوں اور رنجشوں میں بندھے، زندگی کے دن پورے کرتے چلے جا رہے ہیں۔

میرے لیے یہ لمحہ آج بھی زندگی کا حاصل ہے!!

جب پہلے خلانورد نے اس کرہ ارض سے باہر نکل کر اس پر ایک نظر ڈالی تو اس کے منہ سے بے اختیار نکلا تھا: آہ ہماری زمین کتنی خوبصورت ہے! جب تک یہ خلا نورد زمین پر رہا وہ چہروں، پہاڑوں، وادیوں، سمندروں اور شہروں کے حسن و جمال کا نظارہ کرنے پر تو بے شک قادر تھا مگر پورے کرہ ارض کے حسن کا ادراک نہ کر سکا تھا۔ ایسا کرنے کے لیے لازم تھا کہ وہ خود کو کرّۂ ارض سے باہر لے جانے میں کامیاب ہوتا۔ جب اس نے ایسا کیا یعنی زمین سے ذرا دُور چلا گیا تو زمین کے حُسن کو دیکھ لینے میں کامیاب بھی ہوا۔ لہٰذا خوبصورتی کو دیکھنے کے لیے ضروری ہے کہ اس پر ذرا فاصلے سے نظر ڈالی جائے۔ آئینے کو اپنے چہرے کے بہت قریب لے آئیں تو اپنا چہرہ بھی بھیانک لگتا ہے۔ مگر آئینے کو بہت دُور لے جائیں تو اس میں چہرے کا عکس دھندلا بھی ہو جاتا ہے۔ سو مناسب اور موزوں فاصلے ہی سے خوبصورتی کا صحیح ادراک ممکن ہے۔ یہ موزوں فاصلہ ایک ایسا پُر اسرار نقطہ ہے جس سے آگے بڑھنے یا پیچھے ہٹنے سے خوبصورتی ختم بھی ہو سکتی ہے۔ اس روز اگر میں کھڑکی نہ کھولتا تو چاند کی سولہویں رات سے میں اتنے فاصلے پر تھا کہ مجھے اس بات کا احساس تک نہ ہوتا کہ وہ اتنے کوس چل کر میرے کمرے کے باہر آ کھڑی ہوئی ہے لیکن اگر میں کمرے سے نکل کر باہر آ جاتا تو بیشک چاندنی میں بھیگ جاتا مگر ایسی صورت میں پورے منظر کو نہ دیکھ پاتا۔ اس روز میرے لیے کمرا ایسا نقطہ بن گیا تھا جو نہ تو چاند سے بہت قریب تھا نہ بہت دور! بس قریب اور دوری کے اُس سنگم پر تھا جو حضوری کے لیے نہایت ضروری ہے۔ مگر کتنے لوگ ہیں جنھیں اس لمحے کی نوک پر شبنم کے آبدار موتی کی طرح لرزتے چلے جانے کی سعادت حاصل ہوتی ہے؟۔۔۔ بہت کم!

یہ زمین بے حد حسین ہے مگر اس پر بسنے والے بیشتر لوگ اس سے یوں چمٹے ہوئے ہیں جیسے گُڑ کی بھیلی سے مکھیاں چمٹی ہوتی ہیں ان میں سے کسی بھی مکھی کو پوری بھیلی سے غرض نہیں ہے۔ اسے تو اس کی سطح کے صرف اس حصے سے غرض ہے جس میں اس کے پاؤں اترے ہوئے ہیں اور جس پر اس کا بلا شرکتِ غیرے قبضہ ہے۔ کسان جب اپنے کھیت کے عین درمیان کھڑا ہوتا ہے تو اس کی نظریں اپنے کھیت کے مینڈھ سے آگے نہیں جاتیں۔ آگے دیارِ غیر ہے، اجنبی علاقہ ہے۔ اس علاقے سے اس کا کوئی سمبندھ نہیں ہے حالاں کہ اگر وہ لحظہ بھر کے لیے نظریں اٹھا کر دیکھے تو دور افق تک کے سارے علاقے پر باآسانی قابض ہو سکتا ہے۔ قبضہ صرف ہاتھوں سے نہیں ہوتا، کانوں اور آنکھوں سے بھی

ہوسکتا ہے۔ جب میں صبح سویرے دور سے آتی ہوئی بانسری کی لے یا قریب کے گھر سے آتی ہوئی نغمے کی آواز سنتا ہوں تو آن واحد میں یہ آواز میری ہو جاتی ہے۔ اسی طرح اگر میں نظریں اٹھا کر دیکھوں تو دور یوں تک پھیلی ہوئی زمین، اپنی تمام تر خوبصورتی کے ساتھ فی الفور میری تحویل میں آ جائے گی۔ مگر میں نظریں اُٹھا کر دیکھوں، جبھی تو!۔۔۔۔ بیشتر لوگ اپنے پاؤں کے انگوٹھے سے آگے دیکھنے کی نہ تو قدرت ہی رکھتے ہیں نہ حوصلہ! انھیں اس دنیا کی خوبصورتی کا اوراک کیسے ہوسکتا ہے! المیہ یہ ہے کہ جب وہ اشیا کو بہت قریب سے دیکھتے ہیں تو انھیں زیادہ تر اشیا کے داغ دھبے ہی دکھائی دیتے ہیں یعنی بدصورتی ہی کا اوراک ہوتا ہے۔ مناسب فاصلہ داغوں، دھبوں، چھائیوں، شگافوں کو منا کر ملائمت، نرمی، قوس ایسے ابھار اور شبنم ایسی طراوت کا احساس پیدا کرتا ہے اور مظاہر ایک پُر اسرار خوبصورتی کے حامل نظر آنے لگتے ہیں۔ رات کو جب آسمان کے طشت میں مکئی کے پھولے ہوئے دانوں ایسے ستارے چمکتے ہیں تو آسمان کا حسن دو چند ہو جاتا ہے مگر یہ حسن بھی تو مناسب فاصلہ ہی کا زائیدہ ہے۔ ورنہ قریب سے دیکھیں تو آسمان کے طشت میں بکھرے ہوئے یہ سارے پھول درحقیقت آگ کے بھیانک گولے ہیں جن کے قریب جانا بھی ممکن نہیں۔

یہی حال اس کرۂ ارض اور اس کے مظاہر کا ہے۔ فن کار کو اگر ان مظاہر کا حسن دکھائی دیتا ہے تو محض اس لیے کہ اسے قدرت نے اس مقام پر کھڑے ہونے کی اجازت دے رکھی ہے جو دھوپ اور چھاؤں کی ملتی ہوئی موہوم سی سرحد کا دوسرا نام ہے۔ یہ وہ مقام ہے جہاں سے انچ بھر ادھر اُدھر ہو جانے سے انسان یا تو دھوپ کی تمازت کا نشانہ بن جاتا ہے یا پھر سائے کی یخ بستگی کے رحم و کرم پر خود کو پاتا ہے مگر یہ مقام جو روشنی اور تاریکی، گرمی اور سردی کا سنگم ہے، دراصل اس پل صراط کی طرح ہے جس پر سے فن کار ہمہ وقت گزر رہا ہوتا ہے۔ یہ مقام باہر کی دنیا اور اندر کی دنیا کا سنگم بھی ہے اور یہ دونوں سے ایک موزوں فاصلے پر بھی! جبھی تو اس مقام پر کھڑے ہونے سے باہر کا حسن بھی دکھائی دیتا ہے اور اندر کی خوبصورتی بھی اور پھر وہ لمحہ نازل ہوتا ہے جب حسن لخت لخت حالت میں نہیں رہتا، جُڑ کر ایک ہو جاتا ہے اور فن کار خلا نورد کا روپ دھار کر حسن کو اس کی مکمل صورت میں دیکھنے لگتا ہے۔

یہ دنیا حسین ہے مگر اس لیے کہ اس کے حسن کو خواہش نے سہارا دے رکھا ہے۔ اگر حسن کے لیے خواہش ختم ہو جائے تو وہ محض لکیروں، رنگوں اور آوازوں کا ایک غدر نظر آئے۔ اور یہ خواہش بھی عجیب چیز ہے۔ بظاہر لبریز نظر آتی ہے لیکن بباطن خالی ہے۔ اس کے اندر ہوا کا دباؤ اتنا کم ہے کہ یہ

اردگرد کی ہر شے کو اپنے وجود میں سمیٹ لینے پر سدا مستعد رہتی ہے۔۔۔۔بالکل ایک بلیک ہول کی طرح جو ایک ایسا گرداب ہے جس کی خالی آنکھ کے اندر ساری کائنات بھی اُتر جائے تو وہ بھر نہ سکے۔ کہنے والے کہتے ہیں کہ ہماری کہکشاں کے مرکز میں ایک بلیک ہول ہے جس کے گرد یہ کہکشاں مسلسل گھوم رہی ہے۔ یوں کیوں نہیں کہتے کہ کائنات کے مرکز میں بھی ایک گرداب ہے، بلیک ہول ہے ایک کبھی نہ ختم ہونے والی خواہش ہے جس کے گرد ساری کائنات گھوم رہی ہے۔ اگر یہ گرداب نہ ہوتا تو کائنات کبھی کی خلاؤں میں بکھر کر غائب ہوگئی ہوتی۔ یہ حسین کائنات محض اس لیے ہے کہ اس کی کوکھ میں خواہش زندہ ہے۔ وہ کیسے لوگ تھے جو خواہش کو مار دینا چاہتے تھے مگر نہیں جانتے تھے کہ خواہش کو مارنے کی ''خواہش'' کرکے وہ بدستور خواہش کے کلاوے میں جکڑے ہوئے تھے۔۔۔۔اب کھلا کہ سارا حسن خواہش میں ہے بلکہ یہ کہ خود خواہش ہی حُسن ہے! غالب نے بلاوجہ تو نہیں کہا تھا:

ہزاروں خواہشیں ایسی کہ ہر خواہش پہ دم نکلے

اور غالب سے بڑا حُسن پرست اور کون ہوسکتا ہے!!

☆☆☆☆

غلام جیلانی اصغر

بے خوابی

میں بے خوابی کا مریض ہوں۔ اگر کبھی خوش قسمتی سے آنکھ لگ بھی جائے تو معمولی سے شور یا آہٹ سے آنکھ فوراً کھل جاتی ہے۔ ایسے حادثہ کے بعد پھر عالمِ خواب میں چلے جانا میرے بس کی بات نہیں۔ بعض احباب جب STATUS QUO کا ذکر کرتے ہیں تو مجھے اپنی نیند کے حوالے سے ان کی ذہانت پر تعجب ہوتا ہے۔ سیاست یا نوکری میں تو صورتِ حال کو موڑا توڑا جا سکتا ہے اور اس ترکیب سے صورتِ حال جوں کی توں ہو جاتی ہے۔ لیکن نیند اور بیداری کا مسئلہ بالکل مختلف ہے اس لیے میرؔ کے والدین، بالخصوص والدہ، دساور سے آنے والے مہمانوں کو فہمائش کے طور پر کہہ دیتی تھی کہ سرہانے میرؔ کے آہستہ بولو، میرے متعلق بھی میری بیوی، بچوں کا یہی رویہ ہے۔ جب میں گرمیوں کے موسم میں خبر نامہ کی اذیت سے بچنے کی خاطر نو بجے ہی اپنی خوابگاہ میں چلا جاتا ہوں، تو بچوں کو سختی سے میرے کمرے کے نزدیک آنے سے منع کر دیا جاتا ہے۔ بلکہ انھیں ڈرایا جاتا ہے کہ اگر بابا بیدار ہو گیا تو قیامت صغریٰ بھی بیدار ہو جائے گی۔ دراصل قیامت صغریٰ کا اصلی قیامت سے کوئی تعلق نہیں۔ یہ میری چھوٹی نواسی کا نام ہے جو لگاتار رونے کی وجہ سے حکومت سے پرائڈ آف پرفارمنس حاصل کر چکی ہے۔ اس عنایتِ خسروانہ پر چند اخبار نوسیوں نے یہ غیر معقول تبصرہ کیا ہے کہ آئندہ حکومت صرف شور کرنے والوں کو یہ اعزاز عطا کیا کرے گی۔ خیر یہ تو ایک جملہ معترضہ ہے۔ جسے آپ نظر انداز بھی کر سکتے ہیں۔

میں بات اپنی نیند اور بے خوابی کی کر رہا تھا، بے خوابی مکمل بیداری یا نیند سے مختلف چیز ہے۔ یہ ایک HYPNOTIC کیفیت ہے جس میں آدمی سویا بھی ہوتا ہے اور جاگ بھی رہا ہوتا ہے۔ ذہن کا اوپر والا حصہ جو دال، گوشت، عارضی رشتہ داریوں یا منافقانہ دوست داریوں کا حساب رکھتا ہے وہ تو سویا ہوا ہوتا ہے لیکن زیریں حصہ جس میں ساری خباثتیں بھری ہوئی ہیں اس وقت انتہائی بیدار ہوتا ہے۔ چناں چہ وہ اپنی کمین گاہ سے نکل کر اوپر والی نشست پر متمکن ہو جاتا ہے۔ آمر بھی یہی کام کرتا ہے۔ جب جمہوری یا بظاہر جمہوری نظام حالتِ نوم میں ہوتا ہے تو آمر پوری قوت اور چالاکی سے جمہوری اداروں پر

شب خون مارتا ہےاور مسندِ اقتدار پر صرف بیٹھ ہی نہیں جاتا بلکہ لیٹ جاتا ہےاوراس کے سیاسی حلیف عوام کوڈراتے ہیں کہ وہ شور نہ کریں۔اگرایسا ہواتو سویا ہوامیر بیدار ہو جائے گااور نتیجہ قیامت کبریٰ!

بے خوابی دراصل نینداور بیداری کے درمیان وہ متنازعہ خط یعنیNo Man's Land ہے جہاں دومتضاد کیفیات کنٹرول لائن پرآ کرملتی ہیں۔یعنی سونے والا سوبھی رہا ہوتا ہےاور جاگ بھی رہا ہوتا ہے۔گھر والوں کو یقین ہوتا ہے کہ سربراہ خانہ سورہا ہے۔اس لیے وہ پوری آزادی سےاس کی کنجوسی، لاپرواہی،ادب سے دلچسپی اور دوسری ایسی ہی مکروہات پراُونچے سروں میں تبصرہ کرتے ہیں،سونے والا یہ سب کچھ سُن رہا ہوتا ہےاور بظاہر سوبھی رہا ہوتا ہے۔اس طرح وہ سوتے جاگتے کا مرکب بن جاتا ہے۔ایسے کردارآپ کوداستانوں میں ملیں گے۔یہ کردار محض تخیل کی تخلیق نہیں ہوتے بلکہ زندگی کے عکاس ہوتے ہیں۔چناں چہ یہی سربراہ جب اگلی صبح خواب گاہ سے برآمد ہوتا ہےتو بیوی بچوں کوخوش خبری سناتا ہے کہ اس نے آج خواب میں دیکھا کہ سب اہل وعیال اس کی خوابگاہ میں بیٹھے ہیں اوراپنے باپ کی فضول خرچیوں بلکہ شہ خرچیوں کا تذکرہ کررہے ہیں۔اس لیےآج سے انڈے،ڈبل روٹی،جام،دودھ بند۔آئندہ آپ قومی بچت کا ہفتہ منائیں گے۔وہ سب مل کراللہ تعالیٰ کا شکرادا کریں کہ اس نے اپنی رحمت سے انھیں ایسا کنبہ پرور باپ عطافرمایا ہے۔اوردیکھیں آئندہ ۹ بجے رات کے بعد ٹی وی نہ دیکھا کریں کیوں کہ اس پرفضول اور بےکار پروگرام ہوتے ہیں۔اس واقعہ سےآپ یہ نتیجہ بھی اخذ کرسکتے ہیں کہ بے خوابی خاندان سے بھٹکے ہوئے افرادکوصراطِ مستقیم پر لانے کا ایک فطری نظام ہے۔اگرہم بیداری کےلمحات میں بچوں کواخلاقِ جلالی کا سبق دیں تو وہ اسے نصابی مجبوری سمجھ کرسُن تو لیں گےلیکن عمل بالکل اس کے برعکس کریں گے۔اوراس طرح صراطِ مستقیم ان سے دور ہوتی جائے گی،لیکن اگراسی کارِخیر کوخواب سے جوڑ دیا جائےتو یہ سادہ سی حقیقت کشف کا رُوپ دھارلے گی۔اکثر خودساختہ پیر اپنے مریدین کے حلقہ میں فوری کیفیت نوم میں چلے جاتے ہیں جسے اہلِ طریقت وجد کہتے ہیں۔چناں چہ اس نیم خوابی کے عالم میں وہ ان مریدوں پراللہ تعالیٰ کاعذاب نازل کرتے ہیں جواُن پراپنا مال صرف نہیں کرتے۔یہی کام اگر وہ بیداری میں کرتے تو اہلِ شک اُن کی دیانت داری بلکہ ایمانداری کے متعلق شک وشبہ کی ایسی فضا پیدا کردیتے جن سےلوگوں کا یقین متزلزل ہوجاتا۔لیکن یہی بات جب عالم وجد میں کہی جاتی ہےتواس کی دیانت شک وشبہ سے بالا ہوتی ہے۔

نیم بیداری کا علاقہ عالمِ خواب سے ملتا ہے روح کے بند دروازوں کوکھولنے کا بھی ایک

ذریعہ ہے اس لیے اگر آپ کسی پختہ بدکار کو خواب میں دوزخ کے ایک دونیکنی کلر Technicolor سین دکھا دیں تو وہ دوسری ہی صبح ایک نئے، پاکیزہ فرد کی صورت میں برآمد ہوگا۔ اگر آپ کو تاریخ پڑھنے کا شوق ہے تو آپ نے یقیناً پڑھا ہوگا کہ کالنگا کی خوں ریز جنگ کے بعد اشوک کا روحانی کایا کلپ ہو گیا۔ چناں چہ اُس نے اس تبدیلی کے اظہار کے لیے شاہراہوں پر ایسے کتبے نصب کر دیے جن پر امن اور آشتی کے زریں اصول کندہ تھے۔ اشوک جذباتی بحران کے دوران میں میں اسی عالمِ نوم سے گزر رہا تھا۔ جس میں آپ کی ملاقات اپنے اس نیک لیکن پوشیدہ سلف سے ہوئی جو برسوں مناسب موقع کی تلاش میں اپنی کمیں گاہ میں انتظار کرتا رہا۔ یہی سلف اگر کالنگا کی فتح سے پہلے نمودار ہوتا تو اشوک اسے سختی سے جھڑک دیتا۔ ایسا ہی حادثہ سینٹ فرانس آف اسیسی کو پیش آیا تھا۔ آپ ان متاثرین میں میرا بھی شمار کر سکتے ہیں۔ جس زمانہ میں میں گہری نیند سوتا تھا مجھے بُرے بُرے خواب آتے تھے اور میں بہت خوش ہوتا تھا۔ لیکن صبح جب بستر میں ان خوابوں کو تلاش کرتا تو مجھے بڑی مایوسی ہوتی۔ اب بے خوابی کی وجہ سے مجھے خواب آتے تو ہیں لیکن ان کی ترکیب نحوی نہیں کی جا سکتی، کیوں کہ نہ ان میں ربط ہوتا ہے نہ ضبط، بالکل ایسے ہی خواب لیڈی میکبتھ کو آتے تھے۔ نتیجہ خودکشی! خیر: آپ اس روح فرسا ذکر کو چھوڑیے۔ بے خوابی کے مریضوں کے ساتھ ایسے حادثات ہوتے ہی رہتے ہیں۔ آپ افسردہ خاطر نہ ہوں۔ قرأت جاری رکھیں۔

یہ واقعہ حال ہی میں رونما ہوا۔ اس لیے اس کی صداقت روزِ روشن کی طرح عیاں ہے۔ موسم خوشگوار تھا، بارش سے فضا ڈھل گئی تھی اور ستارے پہلے سے زیادہ روشن اور پاکیزہ نظر آتے ہیں۔ چناں چہ جب منظر اتنا دل فریب ہو تو متاہل آدمی پر نیند جلدی غالب آ جاتی ہے۔ میں نے بیگم سے کہا کہ میری چارپائی صحن میں بچھا دے۔ ٹیلی وژن بند کر دے۔ میرے سرہانے پانی کا گلاس اور پائنتی سے ذرا آگے موٹا سا کھیس بھی رکھ دیا۔ صبح سویرے مجھے نو بجے بیدار کر دے کیوں کہ میں لیوی شُومیکر کے متعلق بہت متردّد ہوں۔ میری بیوی لیوی سے تو ناآشنا تھی۔ البتہ اُسے شُومیکر سے اس موچی کا خیال آ گیا جس نے اس کے جوتے کی ہیل کاٹ کر چھوٹی کر دی تھی۔ اس نے کراہت کے بھرپور انداز میں کہا شومیکر پر لعنت بھیجیں اور آپ آرام سے سو جائیں۔ چناں چہ میں ایٹی وان Ativan کی گولی نوشِ جان کر کے اسی اہتمام سے لیٹ گیا جس اہتمام سے مُردے کو دفن کرنے سے پہلے لٹاتے ہیں۔ میرے ڈاکٹر نے مجھے تاکید کی ہے سونے سے پہلے ٹانگیں سیدھی کر لیں۔ دونوں ہاتھ سینے پر باندھ لیں اور چت لیٹ

جائیں۔ دماغ میں اچھے اچھے خیالات مجتمع کرلیں۔ ایسے موقعوں پر میرؔاجی اور اختر شیرانؔی کی شاعری سے پرہیز کریں اور اگر ذہن میں بُرے خیال ہوں تو انھیں کھرچ کر باہر نکال دیں۔ یعنی پورے طور پر RELAX کریں اور ایسا محسوس کریں جیسے آپ مرگئے ہیں اور دنیا اور اُس کی مکروہات سے آپ کا رشتہ مکمل طور پر کٹ گیا ہے۔

چناں چہ میں نے اپنے ڈاکٹر کے مشورہ کے پیشِ نظر ذہن سے سوائے لیوی شُومیکر کے سب خیال حرفِ غلط کی طرح مٹا دیے اور آنکھیں بند کرلیں۔ مجھے یہ تو معلوم نہیں کہ مجھے نیند کب آئی لیکن یہ بات مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ میری نیند کس وقت ختم ہوئی۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ میں اپنے گھر کے پائیں باغ میں سیر کر چکا تھا اور یوگا کی آخری مشق یعنی زمین پر سر رکھ کر ٹانگیں فضا میں ہلا رہا تھا کہ کوئی چیز مجھ سے ٹکرائی اور میں زمین سے کوئی تین چار فٹ بلند ہوا اور پھر سر کے بل زمین کی طرف رُخ کرلیا۔ بس اس کے بعد مجھے کچھ یاد نہیں صرف اتنا یاد پڑتا ہے کہ میرے اہلِ خانہ میری چارپائی کے اردگرد کھڑے سورۃ یٰسین پڑھ رہے تھے۔ اور میں حیرت سے ان کے چہروں کو دیکھ رہا تھا۔ میں نے بیوی سے رازدارانہ لہجہ میں پوچھا ''بیگم وہ ٹکڑا کہاں ہے؟'' اس نے بے دھیانی میں جواب دیا میں نے بلّی کو ڈال دیا تھا۔ مجھے انتہائی دکھ ہوا اور میں پھر سے رسمی مُردہ کی طرح اپنے بستر میں لیٹ گیا۔

صبح جب میں بیدار ہوا تو اخبار کے اندر کے صفحے پر یہ خبر جلی حروف میں نمایاں تھی ''خلائی سائنس دان پیٹریشیا وائٹ ہاؤس نے کہا ہے کہ لیوی شُومیکر کا تیسرا ٹکڑا ایک بم کے دھماکے سے پھٹا اور مشتری کے اردگرد سرخ روشنی کا ہالہ بنا کر دس منٹ بعد غائب ہوگیا۔ ہمیں خدا کا شکر ادا کرنا چاہیے کہ اس حادثہ کے اثرات سے کرہ ارض محفوظ رہا۔ اب دیکھیں کہ جمعہ کو کیا ہوتا ہے''۔ میں نے یہ خبر پڑھ کر اہلِ خانہ کو مبارک باد دی اور انھیں بتایا کہ رات لیوی شُومیکر مجھ سے ٹکرایا تھا۔ لیکن شکر ہے کہ ہم دونوں محفوظ رہے۔ میری بیٹی اس مژدۂ جانفزا سے مسکرائی اور آہستگی سے کہا۔ "اصل قصور تو دال چاول کا ہے"۔۔۔۔ لیکن میں اپنی جگہ مطمئن تھا کہ میں نے اتنے بڑے کاسمک (COSMIC) حادثہ کو اپنی بے خوابی کے یادگار لمحوں میں اپنے اندر جذب کرلیا۔ میری ایثار پیشگی کی وجہ سے اہل زمیں تو بچ گئے، لیکن اب بھی کبھی کبھی نیم بیداری کے عالم میں وہ دھماکا میرے اندر ہوتا ہے۔ میرے لیے دعا کریں!

☆☆☆☆

جمیل آذر

مکالمہ

وہ بزرگ دانش ور مجھ سے کوئی پانچ چھ سال بڑا ہوگا مگر وہ بہت پرفن ہے۔ اُسے گفتگو کرنے کا ڈھنگ آتا ہے۔ داستان گوئی پر اُسے عبور حاصل ہے۔ اُس کے سامنے جہاں اور عقیدت مند بیٹھتے ہیں میں بھی بیٹھ جاتا ہوں۔ اُس کی باتوں میں ایسا عارفانہ رنگ ہے جو سامعین کو مبہوت کر دیتا ہے مگر میرا مسئلہ عام سامعین سے قدرے مختلف ہے۔ میں باہوش وحواس' اپنے پورے شعور کے ساتھ اُس کی صوفیانہ اور مابعدالطبیعیاتی باتیں سُنتا ہوں اور اُنھیں تجزیے کی کٹھالی سے گزارتا ہوں۔ سچی بات تو یہ ہے کہ وہ اُن معاملات کو چھوتا ہی نہیں جن میں اختلاف کی گنجائش ہو مگر کل اُس دانشور نے ایسی بات کہہ دی جس پر صاد کرنا میرے لیے مشکل ہو گیا اور جب اُس نے اپنی بات میں وزن پیدا کرنے کے لیے یورپ کا حوالہ دیا تو میں مزید اختلاف کرنے پر مجبور ہو گیا۔ وہ کہنے لگا: "جب میں ولایت میں تھا میری لینڈ لیڈی کمرے میں داخل ہونے والے ہر شخص سے کہتی Shut the door behind یعنی اپنے پیچھے دروازہ بند کر دو!'' اِس جملے کی تشریح کرتے ہوئے وہ بولا: ''اِس کا یہ مطلب نہیں کہ آپ کمرے کا دروازہ بند کر دیں' اس سے مراد یہ ہے کہ آپ اپنے ماضی کے دروازے بند کر دیں اور اسے بھول جائیں۔ حال کی دنیا میں زندگی بسر کریں کیوں کہ ماضی آپ کو بے عملی اور ناسٹلجیا یعنی یادِ ماضی کی بیماری میں مبتلا کر دیتا ہے۔ اہلِ یورپ کی ترقی کا راز ہی یہ ہے کہ وہ ماضی میں نہیں رہتے' حال کو بہتر سے بہتر بنانے اور گزارنے کی تگ ودو کرتے رہتے ہیں'' یوں اُس نے اپنے سامعین پر بھی یہی تاثر چھوڑا کہ آپ ماضی کے دروازے بند کر کے آگے بڑھیں۔ اپنے پیچھے دروازہ بند کرنے کی اِس عجیب تشریح کو میرے لیے قبول کرنا مشکل ہو گیا۔

اب میری سوچ سلگنے لگی۔ کیا واقعی ہمیں اپنے ماضی کے دروازے کو بند کر دینا چاہیے؟ میرا خیال ہے کہ یہ تصور گمراہ کن ہے۔ اگر ہم ماضی کے دروازے بند کر دیں تو پھر ہمارے پاس کچھ بھی نہیں رہتا۔ ماضی کوئی ایک دو روز کی بات تو نہیں' یہ تو صدیوں پر محیط آپ کا بیش بہا خزانہ ہے' کبھی نہ ختم ہونے

والاخزانہ! اِس خزانے میں آپ کی تہذیب، تمدن، ثقافت، تاریخ، تجربے، تماثیل، عقائد، زبان، گرامر، شعر و ادب، دیو مالائی کہانیاں، کلاسیکی موسیقی، تمام رسم و رواج اور روایت نہ صرف مامون و محفوظ ہیں بلکہ یہ اکتسابِ فیض کا جاری و ساری چشمہ بھی ہے۔ ماضی کا دروازہ بند کرنے کا مطلب تو یہ ہوا کہ ہم اس چشمۂ فیض کے منہ پر بند باندھ دیں۔ حال کی ساری شادابی ماضی کے رواں چشمے ہی کی رہین منت ہے۔ رومانوی شاعری کی تمام بنیاد ماضی کے حسین تصورات ہی پر قائم ہے۔ کلاسیکی ادب ماضی کے اسالیب اور افکارِ عالیہ سے مملو ہے۔ تمام آسمانی کتابیں دورِ بعید کی یاد دلاتی ہیں۔ مغلیہ دور کے فنِ تعمیر کے نمونے' شاہی قلعہ لاہور' شالا مار باغ' مقبرہ جہانگیر' تاج محل آگرہ' شاہی مسجد لاہور ایسی یادگار عمارتوں کی شکل میں آج بھی موجود ہیں۔ یہ ہمارا عظیم الشان ماضی نہیں تو اور کیا ہے' ہم اِسے بھلا کیسے فراموش کر سکتے ہیں!

ماضی کی اجتماعی میراث کو بھلانا تو در کنار' میں تو اپنے انفرادی ماضی کو بھی فراموش نہیں کر سکتا۔ ہر شب نیند کے گھنے گہرے جنگل میں گم ہونے سے پہلے' میں ماضی کے تمام دروازے کھول دیتا ہوں جہاں سے مجھے جاں فزا ہوا کے جھونکے آنے لگتے ہیں' تسکین بخش واقعات کی تصویریں یکے بعد دیگرے میری بزم خیال میں سجنے لگتی ہیں۔ یہ شہر انبالہ ہے جہاں کا ٹھنڈا میٹھا پانی مجھے توانائی بخشتا تھا' اِسی سرزمین پر دو برگزیدہ ہستیاں' لکھی شاہ اور سائیں جھنڈو شاہ' ابدی نیند سو رہی ہیں۔ لکھی شاہ کے مزار پر ہر سال پنکھے کا میلہ لگتا تھا۔ یہیں سے ٹھیلوں پر سوار گانے والیاں اپنے پورے حسن و جمال کے ساتھ اندرونِ شہر لوگوں کے جم غفیر کے درمیان رات کو گیس لیمپوں کی روشنی میں اپنے سحر انگیز نغمے الاپتے گزرتی تھیں۔ اُن پر روپوں اور پھولوں کی بارش ہوتی تھی۔ ماضی کے بطن سے میرے ننھیال کا خوبصورت گاؤں نلوی طلوع ہوتا ہے جہاں بیروں اور آموں کے لاتعداد باغ ہوتے تھے جن کی خوشبو' مٹھاس اور لذت مجھے اب بھی یاد ہے۔ یہ میرے ماضی کا لاہور ہے۔ جس نے لاہور نہیں دیکھا اُس نے کچھ نہیں دیکھا۔ یہ برصغیر کی تقسیم سے پہلے کا بھاٹی دروازے کا ناولٹی سینما ہے جہاں میں نے سنسنٹ فلم ''طوفان میل کی واپسی'' دیکھی تھی۔ جان کیکاؤس اور نادیا کی خطرے سے بھرپور اداکاری بڑی سنسنی خیز تھی۔ اِس سینما میں ''منگتی'' دیکھی تھی۔ ہیرو نے راوی کے پل سے چھلانگ لگا کر ڈوبتی ہوئی ہیروئن کو نہایت بہادری سے بچالیا تھا۔ یہ میکلوڈ روڈ کا ریجنٹ ہے جہاں میں نے ''نجمہ'' جیسی خوبصورت فلم دیکھی تھی۔ اس فلم کا ہیرو اشوک کمار تھا جو میرا بہت ہی پسندیدہ اداکار تھا۔ مجھے اُس کا پتنگ اُڑانے اور گانا گانے کا انداز بہت اچھا لگا تھا۔ اسی شہر ثقافت میں پنواری' سکندرِ اعظم' پکار' چورنگی' تان سین' دیوداس اور بیجو باورا ایسی یادگار فلمیں

دیکھیں جو آج بھی میرے لیے سرمایہ حیات ہیں۔ رتن سینما میں جب ''جگنو'' لگی تو میں دیوانہ وار اُسے دیکھنے گیا۔ دلیپ کمار اور نور جہاں کی اعلیٰ پائے کی اداکاری سے لطف اندوز ہوا۔

مگر ماضی کی یادگار تمثیلوں کے فعالی اثرات کا دارومدار آپ کے زمانہ حال میں تخلیقی اور ثقافتی عمل میں شرکت پر ہے۔ اگر آپ کا حال محض عادت اور تکرارِ عمل سے عبارت ہے' اس میں کوئی تخلیقی ابال نہیں' کوئی مہم جوئی اور شوق آرزو نہیں تو پھر یہ زندگی نا قابل فراموش تمثیلوں' علامتوں اور تجریدوں سے خالی ہو گی جو انفرادی اور اجتماعی دونوں سطحوں پر بے وقعت اور بے معنی ہے۔ لیکن آپ کی سوچ میں اضطراب' عمل میں سرگرمی اور نگاہ میں دل آویزی ہے تو پھر ماضی سے حال کے راستے ارتقائی مناظر طے کرنے اور مستقبل کو روشن بنانے کے تمام امکانات کو قدم بوس پائیں گے۔ میں حال کی تکرار' یکسانیت اور یبوست سے نجات پانے کے لیے ثقافتی عمل میں بھرپور شرکت کرتا ہوں۔ جوں ہی میرے شہر میں سرکس یا کوئی کارنیوال لگتا ہے' میں معمولات کے سب کام چھوڑ کر ببر شیروں' گرانڈیل ہاتھیوں' چست و چالاک بازی گروں کے حیران کن کرتب اور تماشے دیکھنے چلا جاتا ہوں۔ کارنیوال میں رات کے پچھلے پہر کا آخری شو دیکھنے کے لیے' میں ہمیشہ بے حد مشتاق رہتا ہوں۔ رات کا آخری پہر ہے ایک شخص سر سے پیر تک سیاہ Overall میں ملبوس سینکڑوں فٹ بلند سیڑھی پر خاموش' سنجیدہ' پُر وقار انداز میں آہستہ آہستہ چڑھتا ہے اور پھر بلندی پر پہنچ کر ایک مختصر سے چکور پلیٹ فارم پر کھڑا ہو جاتا ہے۔ نیچے پانی سے لبالب بھرا مختصر سے قطر کا لوہے کی چادر کا بنا ہوا کنواں ہے۔ جس کے اردگرد ذرا فاصلے پر تماشائیوں کا ٹھٹھ لگا ہوا ہے۔ وہ خوف وحیرت کے ملے جُلے جذبات کے ساتھ موت کے کنویں میں چھلانگ لگانے والے شخص کو منہ اُٹھا اُٹھا کر دیکھتے ہیں۔ تھوڑی دیر بعد یہ شخص اپنی بڑی سی جیب میں سے مٹی کے تیل کی بوتل نکال کر اپنے اُوپر چھڑکتا ہے اور پھر ماچس کی جلتی تیلی سے اپنے کپڑوں کو آگ لگا کر موت کے کنوئیں میں چھلانگ لگا دیتا ہے۔ مجمع پر ایک سکتے کا عالم طاری ہو جاتا ہے۔ تھوڑی دیر بعد وہ شخص موت کے کنوئیں سے باہر نکلتا ہے اور منہ پر سے نقاب اُلٹ کر تماشائیوں سے مسکراتے ہوئے چہرے کے ساتھ داد وصول کرتا ہے۔ اُف یہ منظر کتنا دل ہلا دینے والا ہے مگر مہم جوئی سے بھرپور حال کا یہ سنسنی خیز ثقافتی منظر' جہاں ہمیں یکسانیت سے نجات عطا کرتا ہے' وہاں مستقبل کے لیے حرکی قوت بھی عطا کرتا ہے۔ زندگی سے مملو ایسے حیران کن فنی اشارے بھلا کوئی کیوں کر بھلا سکتا ہے' یہی فنی اشارے تو ماضی کا یادگار حصہ بن کر ہمیں مسرت بخشتے ہیں!

میں پھر ماضی کے جھروکے میں جھانکتا ہوں ۔ یہ راولپنڈی ہے قیام پاکستان کے فوراً بعد کا راولپنڈی! یہاں شہر میں اردو فلمیں لگتی تھیں اور صدر میں انگلش ۔ پڑھے لکھے معزز لوگ انگریزی فلمیں ثقافتی اعتبار سے دیکھنے کے بے حد شوقین تھے انھیں انگریزی فلموں کے توسط سے میں گریگری پک' مارلن برانڈو' کیری گرانٹ' الزبتھ ٹیلر' رابرٹ ٹیلر' ایوا گارڈنر' ایسے متعدد اداکار چہروں سے روشناس ہوا۔

میرے ماضی کے بیش بہا خزانوں میں میرے دیہات اور شہروں کے سکول اور کالج آباد ہیں جن سے فیض یاب ہوکر میں زندگی کی دشوار گزار راہوں پر چلنے کے قابل ہوا۔ میں نے بچپن میں ایک فلم پروفیسر دیکھی تھی۔ اس فلم کا ہیرو پنکھج ملک تھا۔ اُسے پروفیسر کے کردار میں دیکھ کر مجھے پروفیسر بننے کا شوق چرایا۔ اس کردار ہی کی دین ہے کہ میرا شوق اور خواب حقیقت کے روپ میں ڈھل گیا۔ یہ ماضی کی حرکی قوت (Motor Force) ہی تو ہے جس نے تا حال مجھے خوشیوں سے سرشار رکھا۔ ماضی کے گرم و سرد تھپیڑے کھانے کے بعد ہی آدمی حال کی نعمتوں سے مالا مال ہوتا ہے اور حال کے تخلیقی اور ثقافتی عمل سے گزر کر ہی آدمی مستقبل کی سرسبز وادیوں میں محوِ خرام ہوتا ہے۔ مستقبل کے لیے حال میں بنائے ہوئے منصوبے اور کیے ہوئے فیصلے آپ کی زندگی میں اہم کردار ادا کرتے ہیں۔

فی الحقیقت ماضی ہمیں مضبوط بنیاد فراہم کرتا ہے۔ ہمارے ماضی کی تمثیلیں جتنی زیادہ حرکی ہوں گی' ہمارا حال اور مستقبل اُتنا ہی تابناک ہوگا۔ ماضی ہمیں اعتماد بخشتا ہے تو حال ہمیں جہدِ مسلسل کی طرف ابھارتا ہے اور مستقبل کامیابی کی نوید دیتا ہے۔ ماضی' حال اور مستقبل کے اس پُراسرار تسلسل کو ہم علیحدہ علیحدہ کر ہی نہیں سکتے۔ یہ تو بیک وقت ساتھ ساتھ چلتے ہیں۔ ماضی ہمارے حال اور حال ہمارے مستقبل پر پیہم اثر انداز ہوتا رہتا ہے۔ ہمارا ہر فعل چند لمحوں بعد ماضی اور مستقبل میں تبدیل ہو کر نئی تہذیب کا حصہ بن جاتا ہے اور متنوع تمثالوں میں ڈھل جاتا ہے۔ پھر ہم ان تمثالوں' علامتوں اور تجریدوں میں زندگی بسر کرتے رہتے ہیں۔

لہٰذا میں اپنے پیچھے دروازہ بند کیوں کروں؟ میں تو اپنے ماضی کے تمام دروازے کھولے رکھنا چاہتا ہوں۔۔۔غموں اور خوشیوں کے ساتھ۔۔۔اپنے ذہن اور دل کے تمام دروازے!

☆☆☆☆

ڈاکٹر انور سدید

درمیان کی دیوار

میرے دوست ''د'' کا خیال ہے کہ ''رشتے دار آسمان سے نازل ہوتے ہیں اور پڑوسی زمین سے اُگتے ہیں''۔ آسمان سے نازل ہونے والی مخلوق کو آپ ہزار کوشش سے بھی راضی نہیں رکھ سکتے اور زمین سے اُگنے والی مخلوق کو بلا وجہ ناراض نہیں کر سکتے۔ پچھلے دنوں ہمارے محلے میں ایک شخص نے اسی قسم کی خفیف حرکت کی اور پھر اِسے اس کا نتیجہ بھی بھگتنا پڑا۔ بات معمولی سی تھی لیکن نوبت گالی گلوچ اور دھول دھپے سے گزر کر عدالت تک پہنچ گئی' ذرا ذہانت سے کام لیا جاتا تو اس معمولی سی بات سے بھی کئی طرب خیز زاویے نکالے جا سکتے تھے' بات کو نظر انداز بھی کیا جا سکتا تھا۔

واقعہ یوں تھا کہ ہمارے گھر کی شمالی دیوار کی پرلی طرف جو صاحب رہتے ہیں انھیں فلمی موسیقی سے بڑی رغبت ہے' ایک دن ان کے جی میں کیا آئی کہ اپنے ریڈیو کے ساتھ لاؤڈ سپیکر لگا دیا۔ نیک مقصد شاید یہ تھا کہ دوسرے اہلِ محلّہ بھی ان کے ریڈیو سے فیض یاب ہوں اور فرمائشی پروگرام کا لطف اُٹھائیں لیکن ایک اور صاحب کو جو ہمارے مشرق میں قیام پذیر ہیں یہ بات ناگوار گزری۔ انھوں نے اپنے سٹور روم سے ٹین کا خالی کنستر نکالا' ایک چوبِ خشک تلاش کی' اور ٹین کو بے ہنگم ضربوں سے بجانا شروع کر دیا۔ پھر کیا تھا؟ ۔۔۔ پہلے ریڈیو کی مدھر موسیقی کی لہریں ٹین کی پاپ موسیقی سے ٹکرائیں اور پھر دونوں پڑوسی دست بہ گریبان ہو گئے۔ اگرچہ دوسرے اہلِ محلّہ کا استحقاق بھی مجروح ہوا تھا لیکن قومی اسمبلی کا منظر عملی صورت میں ان دو پڑوسیوں نے پیش کیا' دوسرے لوگوں کے بیچ بچاؤ کرانے سے پہلے ہی معاملہ تھانے گیا' پھر عدالت میں پہنچ گیا۔

شہر میں رہنے والوں کے دل بے شک آپس میں نہ ملیں لیکن ان کے گھروں کی دیواریں آپس میں پشت سے پشت ملا کر اس طرح کھڑی ہوتی ہیں جیسے جڑواں بہنیں ہوں اور جنھیں کسی بڑے آپریشن کے بغیر جدا کرنا ممکن نہ ہو۔ آپ درمیان کی دیوار کو ایسا سکّہ بھی قرار دے سکتے ہیں جس کے ایک رُخ سے آپ کے پڑوسی کی شخصیت ہویدا ہے اور دوسرے رُخ سے آپ کا کردارِ شریف عیاں ہوتا ہے۔ یہ

ایسی سرحد ہے جس کے دونوں اطراف پر علیحدہ اور متخالف نظریات کی خود مختار سلطنتیں آباد ہیں اور بعض اوقات تو یوں بھی ہوتا ہے کہ دونوں سلطنتوں میں سفارتی تعلقات تک قائم نہیں ہوتے اور سلطنت کے سربراہان کی باہمی ملاقات تو بالکل خارج از بحث ہے۔ تعلقات قائم ہو جائیں تو سرحدی ملاقاتوں کا سلسلہ ایسا شروع ہو جاتا ہے کہ دوسری سلطنتوں میں حسد کا طوفان اُٹھ کھڑا ہوتا ہے۔ ایک سرد جنگ کی کیفیت پیدا ہو جاتی ہے۔

اب دیکھیے کہ میرے گھر کی مشرقی دیوار کی پرلی طرف جو صاحب رہتے ہیں ان سے گزشتہ بارہ برس کے دوران میں میری ملاقات نہیں ہوئی۔ اگلے دن وہ مجھے اچانک شادی کی ایک تقریب میں مل گئے۔ تعارف ہوا تو یہ خوشگوار حیرت ہوئی کہ ہم دونوں ایک دوسرے کے پڑوسی ہیں۔ لیکن درمیان میں دیوار ہونے کی وجہ سے آپس میں متعارف نہیں ہیں' شادی کی اس تقریب نے ہمارے درمیان سے اجنبیت کی دیوار گرا دی تھی لیکن یہ بھی ممکن ہے کہ ویسے سے پہلے ہی یہ دیوار پھر کھڑی ہو جائے اور ہم ایک دوسرے کے لیے پھر اجنبی بن جائیں' وجہ یہ کہ میرے پڑوسی جب ملگجے اندھیرے میں اُٹھ کر اپنی فیکٹری کو جا رہے ہوتے ہیں تو میں اس وقت اخبار کے آخری ایڈیشن کی کاپی پریس میں بھجوا کر اور آنکھوں میں رت جگا لے کر دفتر کے باہر ادارے کی گاڑی کا انتظار کر رہا ہوتا ہوں۔ اس وقت مجھے اپنے کمرے میں پہنچنے اور پردے گرا کر جلد سو جانے کی فکر لاحق ہوتی ہے۔ کسی سے ملنے کی خواہش تو دور کی بات ہے کسی سے لڑنے کی تمنا تک نہیں ہوتی ' اس لیے امکان اس بات کا بھی ہے کہ آئندہ دس برس تک ہم دونوں الگ الگ رستوں پر چلتے رہیں اور ندی کے دو کناروں کی طرح قریب ہونے کے باوجود معانقے اور مصافحے سے محروم رہیں۔

آپ حیران ہوں گے مغرب کی جانب جو صاحب رہتے ہیں' میں ان سے بھی اتنا ہی نا آشنا ہوں جتنا وہ مجھ سے ناواقف ہیں۔ مجھے یہ تک معلوم نہیں کہ انھوں نے یہ مکان خریدا ہے یا کرائے پر لے رکھا ہے اور وہ میرے بارے میں یقیناً نہیں جانتے ہوں گے کہ مجھے یہ مکان کسی پراپرٹی ڈیلر نے فراہم کیا ہے یا میں نے اِسے خود بنایا ہے' یہ بات تو انھیں بالکل معلوم نہیں ہو سکتی کہ اس مکان کی بنیاد کی پہلی اینٹ ملک کی ایک ممتاز افسانہ نگار خاتون نے رکھی تھی تا کہ اس گھر کے ساتھ ادب کا رشتہ مضبوط ہو جائے ' ادب کی روح میرے بچوں کے جسم میں بھی سرایت کر جائے' افسوس کہ میرے بچوں نے ادیب بننے کے بجائے سائنس کے عملی شعبوں کو ترجیح دی' ایک نے ڈاکٹر اور دو نے انجینئر بننا پسند کیا۔ چوتھا بیٹا

انسانوں کا ڈاکٹر نہ بن سکا تو اس نے حیوانیات میں ڈاکٹریٹ کرنے کے بعد مرغیوں کی تیمارداری شروع کردی۔ میں یہ سب باتیں درمیان کی دیوار سے پرے رہنے والے پڑوسیوں کو بتانا چاہتا ہوں لیکن گزشتہ کئی برسوں سے اس کا محل پیدا نہیں ہوسکا اور آئندہ بھی موقعہ ملنے کی امید کم ہے۔

دلچسپ بات یہ ہے کہ درمیان کی دیوار کے باعث ہم اجنبی ضرور ہیں لیکن اس کے باوجود ایک دوسرے کے بارے میں بہت کچھ جانتے بھی ہیں' درمیان کی دیوار اگرچہ سدِ سکندری کی طرح حائل ہے لیکن یہ ہماری باتوں کے پرندوں کی آزادانہ پرواز کو روک نہیں سکتی' دوسری طرف کی سلطنت کی جو خبر اخبار میں معمولی سی جگہ نہیں پاسکتی وہ جب ہوا کے دوش پر ہماری سلطنت میں پہنچتی ہے تو شہ سُرخی جیسی اہمیت حاصل کرلیتی ہے' اور بعض اوقات تو معمولی معمولی باتوں سے دوسری طرف کی سلطنت کی نفسیاتی کیفیت عیاں ہوتی چلی جاتی ہے۔

ابھی کل کی بات ہے کہ بجلی کی رَو اچانک چلی گئی۔ دوسری طرف سے آواز سنائی دی۔

''مُنّے کی ماں ذرا ماچس لانا، گیس لیمپ جلانا ہے''۔

مُنے کی ماں اس کچی عرضی پر غور نہیں کرتی تو ایک چیختی ہوئی آواز آتی ہے:

''تم کہاں مرگئی ہو، سنتی نہیں ہو میں ماچس مانگ رہا ہوں''

لیکن اِسی لمحے جب بلب روشن ہوجاتا ہے تو فیصلہ کن مردانہ آواز آتی ہے:

''اچھا بھاڑ میں جاؤ' اب مجھے ماچس کی ضرورت ہی نہیں رہی' بجلی آگئی ہے''۔

اس وقت کچھ اس قسم کا ڈراما ہمارے گھر میں بھی چل رہا ہوتا ہے۔ فرق صرف یہ ہے کہ اگر بجلی دیر تک نہ آئے تو میری بیوی خود آکر گیس لیمپ روشن کردیتی ہے اور ساتھ ساتھ کہتی جاتی ہے:

''یوں ہی آسمان سر پر اُٹھا لیا تھا، بھلا موت کے آنے اور بجلی کے جانے کا وقتِ مقرر ہے؟''

اور لیمپ روشن کر کے وہ فوراً باہر نکل جاتی ہے۔

پڑوسیوں کے گھر خاوند کا کوئی ملنے والا آجائے تو آوازوں کی کیفیت ہی سے میں ان کے تعلقات کا اندازہ لگا لیتا ہوں۔ صاحبِ خانہ کا دوست جتنا دیرینہ ہو، ان کی بیوی اتنا ہی زیادہ بُڑبڑاتی ہے۔ چائے دیر سے بھیجتی ہے۔ کھانے کی چیزوں کو الماری میں محفوظ رکھتی ہے، چائے دانی میں رنگ کم ڈالتی ہے اور اس کوئی کوزی سے ڈھانپنے کا تو اُسے خیال تک نہیں آتا۔ دودھ بھی ٹھنڈا ہوتا ہے، بیوی کے گاؤں سے کوئی مہمان آجائے تو المیہ طربیہ میں تبدیل ہوجاتا ہے۔ دونوں میاں بیوی مہمان کے

سامنے بچھ بچھ جاتے ہیں اور بڑے اشتیاق سے بچوں کے ماموؤں اور خالاؤں کا حال پوچھتے ہیں لیکن اس سب سے بیوی کا شوق اور میاں کی مجبوری چھپی نہیں رہتی۔

یہ دونوں تجربے میرے لیے بے حد فرحت افزا ہیں، اس وقت ہر چند میری آنکھیں نیند سے بوجھل ہوتی ہیں لیکن دیوار کی کسی جھری میں سے دوسری طرف جھانکنے کے بجائے ہوا کے دوش پر خود بخود میری طرف آنے والی آوازوں میں جو لطف ہے اس کی داد صرف وہی شخص دے سکتا ہے جس کی دیوار کے دوسری طرف کوئی پڑوسی موجود ہے۔

میں نے دیوار کی جھری سے دیکھنے کا تجربہ بھی کیا ہے لیکن یہ مجھے قطعاً اچھا نہیں لگا۔ حالاں کہ اس میں سامع نوازی کے علاوہ دیدہ نوازی کے مواقع بھی موجود ہیں۔ بظاہر یہ ایسے ہی ہے جیسے آپ ریڈیو سننے کے بجائے ٹیلی وژن دیکھ رہے ہوں لیکن قباحت یہ ہے کہ جھانکا جھانکی کے اس عمل میں ضمیر پر ہمیشہ کچوکے لگتے ہیں اور احساسِ جرم ذہن میں مستقل طور پر جانشین ہو جاتا ہے۔ ہر وقت خطرہ رہتا ہے کہ کوئی دیکھ نہ لے اور اس خفیف الحرکتی پر شرمندہ نہ کرے۔ ذرا سی آہٹ پر روزن سے ہٹ کر اپنے معمول کے کام میں مصروفیت ظاہر کرنی پڑتی ہے۔ یہ سب کچھ اتنا مصنوعی ہے کہ اگر لمبے عرصے تک اختیار کیا جائے تو پوری شخصیت مسخ ہو جاتی ہے۔ میرے ایک دوست ع، ق نے اسے پہلے شوقیہ طور پر قبول کیا، پھر اسے عادت میں ڈھالا اور آخر آخر میں مخبری کو اپنا پیشہ بنالیا۔ چناں چہ اسے معاشرے میں جہاں کوئی روزن نظر آتا ہے وہ اپنی آنکھ اس پر چسپاں کر دیتا ہے۔ دوستوں کے ڈرائنگ روم۔۔۔ رشتہ داروں کے دیوان خانے، افسروں کے دفتر کوئی اس سے محفوظ نہیں تھا۔ میرا یہ دوست ہر چند شریف شہری تھا لیکن اب کسی خفیہ تنظیم کا ایجنٹ لگتا تھا۔ ستم یہ کرتا کہ جو کچھ دیوار کی جھری سے چھپے چوری دیکھتا اسے اگلے دن بالواسطہ طور پر اخبار میں چھاپ ڈالتا۔ اس بدعملی کی وجہ سے صورت ایسی مسخ ہوئی کہ لوگ خوف کھانے لگے۔ ڈرتے رہتے کہ ان کی کوئی بات اخبار میں بالواسطہ یا بلاواسطہ نہ چھپ جائے، رفع شر کے لیے انھوں نے ایک عجیب انداز وضع کیا کہ اس کے کالم کی تعریفیں اس کے منہ پر کرتے اور رفع شر کے لیے چندہ جمع کر کے اِسے بیرونِ ملک بھجوا دیتے۔

ممکن ہے کہ آپ پڑوسیوں سے میری عدم ملاقات کو اس دیوارِ برلن سے منسوب کریں جسے توڑنے کا ہمارا کوئی ارادہ نہیں۔ اِسے آپ میری انا کا شاخسانہ قرار دے کر مجھے مغرور اور نخوت پسند بھی کہہ سکتے ہیں، حقیقت یہ ہے کہ میں نے اب ایک بڑے شہر میں رہائش اختیار کر رکھی ہے۔ اس شہری

بودوباش کے تہذیبی طریقے تبدیل ہو گئے ہیں، جب یہ شہر فصیل میں سمٹا ہوا تھا تو لوگ اپنی انفرادی زندگی بسر کرنے کے بجائے دوسروں کے لیے زندہ رہتے اور اجتماعی زندگی گزارتے تھے۔ سب ایک دوسرے کی خوشی میں شامل ہوتے تھے۔ دوسرے کے غم میں شریک ہونے اور دُکھ بانٹنے کا کوئی موقع فروگزاشت نہیں کرتے تھے۔ پورا شہر ایک خاندان کی طرح گتھا ہوا اور مربوط تھا۔ لیکن اب یہ شہر فصیل کی حدود سے نکل کر کیکٹس کی طرح مشرق اور مغرب، شمال اور جنوب ہی میں نہیں عمودی اور اُفقی اطراف میں بھی پھیل گیا ہے۔ اس کی شش جہاتی وسعت میں آبادی جتنی بڑھ گئی ہے ملاقات کے مواقع اُتنے ہی کم ہو گئے ہیں۔ اجنبیت کا کینسر پورے شہر میں پھیلا ہوا ہے۔ ہر شخص دوسرے سے غافل ہے، اپنے فکر میں مبتلا اپنی ذات کو بچا رہا ہے لیکن یہ نہیں جانتا کہ تنہائی اور اجنبیت کا کینسر آہستہ آہستہ اُسے چاٹتا جا رہا ہے۔

شہر کی بہ نسبت مجھے اپنا گاؤں اب بھی ایک نعمتِ غیر مترقبہ نظر آتا ہے، اس میں جو اخوت ہے وہ شہر میں کہاں؟ گاڑی سے اُتر کر گاؤں کی زمین پر پاؤں رکھتے ہی دھرتی آپ سے باتیں کرنے لگتی ہے، درختوں کے پتے سرسراتے ہیں تو یوں لگتا ہے جیسے آپ سے ہم کلام ہو کر خیریت دریافت کر رہے ہیں۔ گاؤں میں اشخاص ہی نہیں نباتات اور جمادات بھی آپ کی حیات کا جزو بن جاتے ہیں، مجھے چھوٹی سی نہر کے کنارے وہ میل کا پتھر کبھی نہیں بھولا جو طالب علمی کے زمانے میں امتحان کے دنوں میں مجھے مطالعے کے لیے اپنے پاس بلا لیا کرتا تھا اور پھر ایسی خلوت مہیا کرتا کہ کتاب کا ایک ایک لفظ ذہن میں محفوظ ہوتا چلا جاتا، مجھے اگر زندگی میں کچھ کامرانیاں ملی ہیں تو ان میں نہر کنارے کا یہ سنگِ میل بھی شامل ہے، بعد کی طویل عملی زندگی میں مجھے ہمیشہ آراستہ پیراستہ دفتر ملے لیکن جو ارتکازِ فکر و نظر اس سنگِ میل کی معیت میں حاصل ہوا، وہ پھر کبھی نصیب نہ ہو سکا۔

اب ایک عرصے سے میں نے گاؤں چھوڑ رکھا ہے۔ رزق کی تلاش مجھے شہر شہر، قریہ قریہ اُڑا کر لے جاتی رہی ہے۔ حتیٰ کہ میں اب سرکاری ملازمت کے ختم ہونے کے بعد اس بڑے شہر میں آ کر آباد ہو گیا ہوں۔ میں نے اس شہر کی جس محلّہ نما بستی میں بودوباش اختیار کی ہے اس سے پرے کئی فیشن ایبل آبادیاں ہیں، ان میں ہزاروں خوبصورت کوٹھیاں ہیں، ہر کوٹھی کو دیکھ کر یوں لگتا ہے جیسے یہ عمارت کسی شاہ جہان نے اپنی ممتاز محل کے لیے بنائی ہے۔ یا اطراف و جوانب کے پھیلے ہوئے سبزہ زار سے ایک دلکش بنگلہ اُبھر کر جنتِ نظیر بن گیا ہے، ان عمارتوں میں کوئی بات بھی کرے تو وہ غلام گردشوں ہی میں گم

ہو جاتی ہے۔ میں جب بھی اس طرف سے گزرتا ہوں تو مجھے یہاں تنہائی، ویرانی اور خاموشی پُر افشاں نظر آتی ہے۔ اس وقت مجھے ایک اینٹ کی وہ دیوار کتنی اچھی لگتی ہے جس کے دوسری طرف ایک کنبہ نہیں پورا ایک جہان آباد ہے۔ اس جہان کی آوازیں میری اپنی فریکوئنسی پر سفر کرتی ہیں اور جب مجھ تک پہنچتی ہیں تو محسوس ہوتا ہے کہ میں انجمن میں تنہا نہیں ہوں بلکہ یہاں میرے بہت سے راز دان بھی موجود ہیں، یہی وہ لمحہ ہے جب اجنبیت کا سارا کینسر ختم ہو جاتا ہے، زندگی میں چہل پہل نظر آنے لگتی ہے۔ درمیان کی دیوار موجود ہونے کے باوجود دوسرے گھر کی خوشیاں میرے آنگن میں آکر چہچہانے لگتی ہیں۔

میں کتنا خوش قسمت ہوں۔

☆☆☆☆

حامد برگی

کھڑکی

اگر مجھے تصویر کشی آتی تو اپنی ہر تصویر میں ایک کھڑکی ضرور بناتا۔ چھوٹی بڑی تنگ کشادہ جدید طرزِ تعمیر کا نمونہ یا قدیم وضع کی محرابوں والی، پھول بوٹوں سے سجائی ہوئی کھڑکی، رنگ برنگ پردوں سے آراستہ یا لوہے کی سلاخوں گرِلوں سے محفوظ کی ہوئی کھڑکی، شیشے کے دروازوں والی یا لکڑی کے پٹ والی سادہ یا چوبی کام والی کھڑکی۔!

کھڑکی کے ڈیزائنوں میں بڑا تنوع ہے مگر مضمون سب کا ایک ہے۔ اسی لیے تو کھڑکی مجھے انسپائر کرتی ہے۔ تصویر کشی کے لیے بھی انسپائریشن کی ضرورت ہے۔ پراسراریت کی، کھوج نکالنے کی، شے کے پیچھے جھانکنے کی، اسی لیے تو اگر میں مصور ہوتا تو کھڑکی کو اپنا مرکزی خیال بناتا کچھ اس طرح کے دیکھنے والا ایک تجسس ایک ہلچل ایک تحریک سی اپنے دل و دماغ میں محسوس کرتا کھڑکی کھلنے کا منتظر رہتا اندر جھانکنے کے لیے بے تاب ہوتا تصویر کے ظاہر سے زیادہ تصویر کے باطن میں اترنے کی کوشش کرتا۔ اپنے تخیل و تصور کی سیڑھیاں لگا کے یہی تو کسی شہکار کا کمال ہے کہ وہ اپنے مخاطب کو اُٹھا کے اپنی پراسرار وسعتوں میں لے جائے۔ کھڑکی اس سلسلے میں بڑی ممد و معاون ثابت ہوتی ہر تصویر کو معنی خیز بناتی۔!

میں مصور تو کبھی بھی نہیں تھا مگر مجھے تصویر کشی کا شوق ہمیشہ رہا بچپن میں نظم ''ٹونکل ٹونکل لٹل سٹار'' (Twinkle Twinkle Little Star) سے متاثر ہو کر میں نے ایک بڑے سے چارٹ پر ایک بڑی سی کھڑکی بنائی تھی بڑے بڑے بڑے خانے بنا کر شیشوں کو ظاہر کیا تھا، ایک طرف پردوں کی جھلک دکھائی تھی نیچے ایک کونے میں ایک بچہ فلک کی وسعتوں میں جھانکتا ہوا دکھایا تھا باہر آسمان کی دھندلاہٹوں میں ایک روشن ستارہ اس کی نظروں کا مرکز تھا۔ آج بھی وہ تصویر میرے ذہن کے پردے پر کھنچی ہے۔ آج بھی جب کہ میں اپنی زندگی کی نصف صدی بتا چکا ہوں وہ بچہ اسی طرح ٹکٹکی باندھے فلک کی وسعتوں میں گم ہے۔

سوچتا ہوں اور زندگی کی نصف صدی بتا کر سوچتا ہوں کہ زندگی بھی تو ایک کھڑکی ہے جس کے

ایک گوشہ میں ہم زندگی کے تمام روشن امکانات پر نظریں جمائے بیٹھے ہیں اور ہر دم پھیلتی بڑھتی اور وسیع سے وسیع تر ہوتی ہوئی دنیا کو دیکھ رہے ہیں چاروں طرف چھائے ہوئے اندھیروں میں روشنیوں کو تلاش کر رہے ہیں مُرورِ زمانہ کے ساتھ زمانہ نے ترقی کی ہے اور تصویر کچھ متحرک بھی نظر آنے لگی ہے، روشنیاں اندھیروں میں تیرنے لگی ہیں اور ہماری نظریں ان کا تعاقب کر رہی ہیں۔

کھڑکی ہمارے لیے امید کا استعارہ ہے، جب تک ہماری زندگی میں یہ کھڑکی کھلی ہے ہماری عملی زندگی جاری ہے ہماری کامیابی کے امکانات روشن ہیں ہم زندگی کی شاہراہ پر رواں ہیں اس کھڑکی کا بند ہونا زندگی کے تمام تر امکانات کو کھونا ہے، یہ کھڑکی کھلی ہی رہنی چاہیے۔!

عموماً خیال کیا جاتا ہے کہ کھڑکی گھر کو روشن کرنے کے لیے ہے لیکن کھڑکی صرف روشنی ہی کی نہیں ہوا کی بھی گزرگاہ ہے۔ روشنی اور ہوا دونوں کا زندگی سے بنیادی تعلق ہے۔ ہوا کی اس گزرگاہ میں بیٹھ کر کیف و سرور کی جو کیفیت طاری ہوتی ہے وہ انسانی زندگی کا ایک طربناک پہلو ہے یہ کیفیت ایک سچے انسان کے سوا شاید اور کسی کو نصیب نہ ہو۔

کہتے ہیں۔ تخیل و تصور کی بلند پروازی صرف انسان ہی کو ملی ہے، ہوا کے نرم و نازک جھونکوں کے ساتھ طبیعت میں جو گداز پیدا ہوتا ہے وہ ذہن کو جو کیف نصیب ہوتا ہے یہ کھڑکی کے ذریعے درآنے والی ہوا کے ہی طفیل ہے۔ کھڑکی کا کھلا ہونا شرط ہے لیکن مشاہدہ بتاتا ہے کہ ہوا کے ہاتھوں نصیب ہونے والی یہ سرخوشی صرف انسان کو ہی نصیب نہیں چرندو پرند بھی اس میں سرشار نظر آتے ہیں اور جھومتے بل کھاتے انگڑائیاں لیتے درختوں کا تو ذکر ہی کیا! ہوا اور درختوں کا چولی دامن کا ساتھ ہے ہوا کے ساتھ درختوں اور درختوں کے ساتھ انسان پر بھی وجد کی کیفیت طاری ہونے لگتی ہے۔

کھڑکی اس سلسلے میں انسان اور کائنات کے درمیان رابطے کا کام کرتی ہے۔ بدلتے موسموں کی کیفیات کا اندازہ گھر بیٹھے کھڑکی کے ذریعے ہی ہوتا ہے۔ باہر درختوں کے بدلتے رنگ اور سرسبز و شاداب لہراتی ہوئی یا ٹنگ منگ شاخیں بدلتے موسموں کے روپ کا پتا دیتے ہیں۔ آسمان پر امنڈتے ہوئے بادل اور رنگ بدلتا نیلا شفاف دھندلا سیاہ یا روشن آسمان روز و شب بدلتے موسموں اور وقتوں کا پتا دیتے ہیں۔ گھر میں بیٹھا شخص کھڑکی کے راستے ہی باہر بدلتے ہوئے واقعات و حالات اور موسموں کا علم حاصل کرتا ہے۔

میں سوچتا ہوں اخبارات، ریڈیو، ٹیلی وژن بھی تو کھڑکیاں ہیں جو گھر بیٹھے ہمیں بدلتے

حالات وواقعات اور موسموں کا پتا دیتے ہیں اور دنیا بھر میں رونما ہونے والی تبدیلیوں سے باخبر رکھتے ہیں۔

شعر وادب ونغمہ بھی تو کھڑکیاں ہیں جن سے ہم کسی فنکار کے اندر جھانک کر دیکھ سکتے ہیں اور اگر اس شعر وادب ونغمہ کی گونج ہمارے دل میں پیدا ہو تو ہم خود اپنے اندر بھی جھانک سکتے ہیں۔!

آج کے سکائی سکریپرز اور بلند و بالا پلازوں کی دنیا میں انسان کا بیرونی دنیا سے رابطہ کھڑکی کے راستے ہی رہ گیا ہے کسی سکائی سکریپر کی اٹھارویں منزل پہ بیٹھا ہوا شخص باہر کی متحرک اور رواں دواں زندگی کا نظارہ کھڑکی کے ذریعے ہی کرسکتا ہے اور اپنے آپ کو اس جیتی جاگتی دنیا کا حصہ سمجھ سکتا ہے۔

کھڑکی کا رومانی پہلو وہ انتظار ہے جو کوئی بےقرار دل کھڑکی میں بیٹھے چشم براہ رہ کر اپنے محبوب کے لیے کرتا ہے، جیولیٹ کھڑکی میں بیٹھی ہی رومیو کے لیے محوِ انتظار رہتی تھی ان کی رازدارانہ ملاقاتوں کا سلسلہ کھڑکی کے راستے ہی تھا، پرانے وقتوں میں عاشق دل گرفتہ اپنا پیغام محبت کسی پیشہ ور مغنی کے ذریعے اپنی بےتاب محبوبہ کے حضور پیش کرتا جو اس نغمہ کو سننے کے لیے کھڑکی میں منتظر رہتی۔ نامہ بر کبوتروں کی پرواز بھی کھڑکی سے کھڑکی تک تھی عامیانہ محبتوں کے نامہ و پیام کی راہ بھی کھڑکی ہی ہے، قلعہ شیلاٹ میں محبوس حسینہ کا تعلق باہر متحرک ورنگین ودلچسپ دنیا کے ساتھ کھڑکی کے راستے ہی تھا، غرض کھڑکی عشق ومحبت کی داستانوں میں ایک زندہ کردار کی صورت میں موجود ہے۔ تپتے صحراؤں دشوار گھاٹیوں اور لمبی مسافتوں کو طے کرتا پاتا شہزادہ جب بالآخر اپنی منزل مقصود پر پہنچتا ہے تو اپنے خیال وخواب کی شہزادی کو محل کے غرفہ یعنی کھڑکی میں محوِ انتظار پاتا ہے۔ اور کہیں اس کی خواب گاہ تک اس کی رسائی ہو جائے تو کھڑکی سے چھن چھن کر آتی ہوئی روشنی میں اِسے محوِ خواب دیکھتا ہے اور اس کے حسن خوابیدہ سے مسحور ہوتا ہے۔

کھڑکی کا روحانی پہلو بھی ہے کھڑکی سے باہر آسمانی رفعتوں کی طرف دیکھنا ہی ایک روحانی تجربہ ہے رات ودن صبح وشام کے ساتھ اوقات عبادت کا تعین بھی کھڑکی کے ذریعے ہی ہوتا ہے گھڑی نہ تھی تو کھڑکی تھی گزرتے اوقات کا پتا انسان کھڑکی سے ہی ستاروں کی حرکات وسکنات دیکھ کر چلا لیتا تھا اور علمِ نجوم کے ذریعہ آنے والے وقتوں کی پیش خبریاں بھی کرتا تھا کھڑکی کے ذریعہ ہی اہل اللہ، اللہ کی طرف پکارنے والے کی پکار کو سنتے ہیں اور آغازِ صبح کا اشارہ پرندوں کے چہچہوں اور نغموں میں پاتے ہیں۔

کھڑکی انسانی کاموں میں موجود کسی نہ کسی خامی اور کمی کا اشارہ بھی ہے انسان کے بنائے ہوئے قوانین میں ہزار احتیاط کے باوجود کوئی نہ کوئی ایسی کھڑکی کھلی رہ جاتی ہے جس کا فائدہ اُٹھا کر

قانون کی زد میں آیا ہوا شخص قانون سے بچ نکلتا ہے قانون سے فائدہ اُٹھانے والے لوگ قانون میں ایسی ہی کھڑکی کی تلاش میں رہتے ہیں اور کوئی نہ کوئی کھڑکی ڈھونڈ نکالتے ہیں۔

قانون کے شکنجے میں آیا ہوا انسان روزن زنداں کے سہارے ہی جی رہا ہوتا ہے۔ جو دراصل وہ کھڑکی ہے جس کے ذریعہ زندگی کا رت بدلتی دنیا اور فطرت کے ساتھ تعلق قائم رہتا ہے۔ ورنہ وہ خود کو زندہ در گور محسوس کرتا قید و بند کی مصیبت میں مبتلا شخص کے لیے زندگی کی تمام تر رمق اسی کھڑکی میں ہے اِسی روزن کے سہارے وہ باہر آسمان کی کیفیات کا اور اس کے دامن میں نقاش فطرت کے بنائے ہوئے نقش و نگار کا جائزہ لیتا ہے اور اپنی قید و بند کی گھڑیوں کا شمار اس رات اور دن سے کرتا ہے جس کا اندازہ اِسی روزن کی دھوپ اور چھاؤں سے ہوتا ہے۔

اس زندگی اور ابدیت کے درمیان موت بھی تو ایک کھڑکی ہے، جیتے جی ہم موت کے اُس پار دیکھنا چاہتے ہیں اور آنے والی زندگی کا تصور باندھتے ہیں مگر کھڑکی بند ملتی ہے موت کی یہ پُر اسرار کھڑکی کھلے گی تو ابدیت کا راز آشکار ہوگا۔ جیتے جی ہم اس پُر اسرار کھڑکی کی اوٹ میں بیٹھے کھڑکی کے کھلنے کے منتظر ہیں کہتے ہیں اہلِ جنت کے لیے لحد میں ہی جنت کی کھڑکی کھل جائے گی اور وہ اس کی فرحت بخش ہوا کے جھونکوں کو محسوس کریں گے۔

ہمارے گرد و پیش آنے والی ہر تبدیلی ہمارے لیے امید و آرزو کی نئی کھڑکی کھولتی ہے نجانے آنے والا وقت اس امید و آرزو پر پورا اترے گا کہ نہیں؟ یہ تو آنے والا وقت ہی بتا سکتا ہے۔

زندگی حرکت میں ہے ریل کی طرح ہم اس کی کسی نہ کسی کھڑکی سے باہر مخالف سمت میں بھاگتی دوڑتی زندگی کو دیکھ رہے ہیں ہمیں اپنی بے بسی کا احساس ہے ہم کسی چیز کا رُخ اپنے ارادے سے نہیں بدل سکتے ہمیں ان چیزوں کو اسی صورت میں قبول کرنا ہے اور زندگی کا سفر جاری رکھنا ہے ہماری انفرادی زندگی بھی ریل کا وہ ڈبا ہے جس میں ہم کھڑکی سے لگے بیٹھے زندگی کا یہ سفر تمام کر رہے ہیں۔

☆☆☆☆

گِرہ

ہر ذِ جو ایک گُتھی ہوئی گرِہ ہے، جو وقت آنے پر کُھل جاتی ہے اور یوں اُس میں مقید تمام عناصر دوبارہ زمین کا رِزق بن جاتے ہیں تاکہ کسی دوسری نوع کی گرہ کو جنم دے سکیں۔ دیکھنے میں ہر عبارت، لفظوں کی چھوٹی موٹی گرہوں سے بجی سنوری ایک ایسی ڈور ہے کہ جس میں پرویا ہوا ہر لفظ دوسرے لفظ سے نتھی ہے۔ سو اگر ایک لفظ یا گرہ کو ذرا بے احتیاطی سے کھولنے کی کوشش کی جائے تو سارا شیرازہ بکھر سکتا ہے۔۔۔ لہٰذا یہ کہنا چاہیے کہ گرہ کی عدم موجودگی میں بابِ زندگی کا ایک ورق لکھنا بھی محال ہے۔۔۔ یقین نہ آئے تو لکھ کر دیکھ لیجیے!

گرہ کشائی کا کام نہایت پر پیچ ہے' اسی لیے ہزاروں لاکھوں صوفیا' اولیا' پیغمبر' اس جہانِ رنگ و بو میں لوگوں کی مشکل کشائی کے لیے قدم رنجہ فرماتے رہے ہیں۔ اس کے باوجود دلوں میں پڑی گرہیں کھُل نہیں سکیں..... جوں جوں ان گرہوں سے نپٹنے کی تیز تر کوششیں ہو رہی ہیں' توں توں ان کی تعداد میں اضافہ ہوئے جا رہا ہے۔ کوئی ایک گرہ دار مسئلہ ہو تو آدمی اُسے جیسے تیسے کھول بھی لے: یہاں تو گنجل دار مسائل کے ڈھیر لگے ہوئے ہیں..... ساری کاوشیں اکارت جاتی ہیں۔ دور کیوں جائیں' اپنے آس پاس ہی ایک اچٹتی نظر ڈالنے سے بہت کچھ' مادر زاد برہنہ حالت میں سامنے آ جائے گا..... جیسے رشتوں ناتوں کی ڈوری جو دیکھنے میں سیدھی اور سادہ معلوم ہوتی ہے لیکن ایک بار اُس میں بدگمانی کی گرہ پڑ جائے تو پھر اُسے ہموار کرنا وبالِ جاں ہو جاتا ہے۔ اسی طرح امورِ سلطنت کے رُموزِ خودی و بے خودی پر لحظہ بھر کے لیے توجہ مبذول کی جائے تو نت نئے نعرے اور وعدے' ڈپلومیسیاں اور پالیسیاں' کچی پکی گرہوں کے مانند دکھائی دیں گی۔ جو بالعموم اپنا اُلو سیدھا کرنے کے لیے لگائی اور کھولی جاتی ہیں۔ چناں چہ یہ کہنا کچھ زیادہ غلط نہ ہوگا کہ ہر گھر اور ہر حکومت میں ایک مرکزی گرہ ہوتی ہے جس کے گرد چھوٹی چھوٹی گرہوں کا طواف جاری رہتا ہے: اور خدانخواستہ یہ مرکزی گرِہ ڈھیلی یا کمزور پڑ جائے تو پھر گھر اور حکومت کا اللہ ہی نگہبان ہے۔ اقلیدس میں دائرے کا اصول اپنی جگہ پر ایسی بنیادی گرہ ہے جو

اپنے ایک ہی وار سے مربعوں، مثلثوں اور مستطیلوں کا حلیہ بگاڑ سکتی ہے۔ دوسری طرف زمین سے لے کر کائنات بسیط میں بکھری کروڑوں سنہری گرہوں کی ماہیت کو جاننے کی سعی کی جائے تو اندازہ ہوتا ہے کہ عالمِ اکبر میں پَر پھیلاتی کہکشائیں اور عالمِ اصغر میں پَر سمیٹتی دنیائیں، گرہوں کے ایسے لامتناہی سلسلے ہیں جو کسی مخفی رشتے کی بنیاد پر ایک دوسرے سے بندھے ہوئے ہیں جب کہ انسان کے بنائے ہوئے تمام کلیے قاعدے اور اصول وضوابط' اُس نادیدہ ہستی کے کھوج میں مارے مارے پھر رہے ہیں جو ابتدائے آفرینش سے خود اپنے ہی وجود کی گرہ میں ایک رازِ دُروں کی صورت میں موجود ہے۔

سوئی اور تاگے کا ناتا' گرہ کے وجود ہی سے برقرار ہے۔ یہ ناتا نہ ہو تو سوئی اور تاگے میں سمبندھ قائم ہی نہیں رہ سکتا۔ اِسی کے دم قدم سے سوئی' تاگے کی معاونت سے' کپڑے کے نشیب وفراز میں بیل بوٹے کاڑھتے چلی جاتی ہے ورنہ سوئی کا ناکا' دھاگے کے لیے محض ایک گزرگاہ ہے۔ درحقیقت گرہ کی موجودگی ہی میں دھاگا' اثباتِ ذات کا مظاہرہ کرتا ہے، بصورتِ دیگر اُسے نفیِ ذات کا اعلان کرنے سے بھلا کون روک سکتا ہے! دیکھنے کو تو گرہ، دھاگے کے آخری سرے پر لگی ہوتی ہے لیکن اپنی اہمیت کی بنا پر یہ کلیدی حیثیت رکھتی ہے بھلا یہ کسی معاشرے، نظام یا نظریے کے عقب میں بنیادی گرہ کا فریضہ انجام دیتی ہے۔

شادی بیاہ کا شعبۂ خاص بھی مقدس گرہ کی ایک شکل ہے۔ اس ضمن میں ضرورتِ رشتہ کے اشتہار بھی غور وخوض سے پڑھے جاتے ہیں' جیسے اُن میں کسی ایسے اشتہاری مجرم کے کوائف درج ہوں کہ جس کی گرفتاری میں تعاون کرنے والے کو سرکار نے ایک خطیر رقم دینے کا وعدہ کر رکھا ہو۔ دوسری طرف بعض لوگ منگنی کی انگوٹھی کو ایک ایسی گرہ کا نام دیتے ہیں جس کے اندر مستقبل قریب یا بعید میں رونما ہونے والے سہانے خواب، نگینے کی طرح جڑے ہوتے ہیں حالاں کہ بعض اوقات یہ سندر سپنے، خوابِ محض ثابت ہوتے ہیں۔ سو جب خواہشوں کا قتیل مرد، اپنے لیے کسی مالدار گھرانے کی ''نورِ چشمی'' سے رشتہ جوڑ کر' جراثیم سے پاک بند پیکٹ کے دودھ سے پلے مختلف عمروں کے نصف درجن گول مٹول نونہالوں کا والدِ گرامی کہلانے اور موٹی تنخواہ کی ملازمت حاصل کرنے کا حسین جال بُن لیتا ہے تو پھر ایک دن اپنے ہی تیار کردہ اس آکٹوپس کے نرغے میں آجاتا ہے اور کچھ مدت گزرنے کے بعد اُسے بیگم صاحبہ کی ''تریاہٹ'' بچوں کی ''بالک ہٹ'' اور بڑے صاحب کی ''راج ہٹ'' کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔

اِن حالات میں وہ اپنی ہٹ کا پکا ثابت نہ ہو تو اُس کے سارے حسین ارمان' گانٹھوں کا ایک ایسا انبار بن جاتے ہیں کہ انھیں سلجھانے کی کوشش میں وہ بُری طرح سے اور الجھتے چلا جاتا ہے۔ حتیٰ کہ ایک روز

وہ پھولی ہوئی توند، اُڑے ہوئے بالوں اور دائمی قبض میں مبتلا ایک بد وضع گرہ بن کر رہ جاتا ہے۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ خواہشوں کی گرہیں کم سے کم ہوں تاکہ زندگی کے دھاگوں میں کم سے کم الجھاؤ پیدا ہو۔

دورِ حاضر کے ذہنی اور جذباتی مسائل اور الجھنیں ، جن کا سلسلہ لاشعور کے اٹلانٹس (Atlantis) تک پھیلا ہوا ہے، ایسی گرہیں ہیں کہ جنھیں کھولتے ہوئے کئی بار فرد خود بھی تار تار ہو جاتا ہے، مگر یہ گرہیں ، پکی گانٹھوں کے مانند، اپنی جگہ پر ثابت و سالم رہتی ہیں ۔ چناں چہ عملی نفسیات کے ماہرین کو اس نوعیت کی گرہیں کھولنے سے پہلے بخوبی سوچ بچار کر لینا چاہیے مبادا کہ بعد میں پچھتانا پڑے اور پچھتانے میں ویسے بھی انسان کو یدطولیٰ حاصل ہے اور آج بھی وہ فارغ اوقات میں کفِ افسوس ملنے کا مشغلہ اختیار کیے ہوئے ہے..... یہ حالتِ زار کبھی کبھار اجتماعی پچھتاوے کا روپ بھی دھار لیتی ہے جس کے باعث قوم باقاعدہ پچھتاوے کی آگ میں جلنے لگتی ہے اور اُس کی بچی کھچی شکتی بھی دھواں دھواں ہو جاتی ہے..... یہی نہیں، پچھتاوا تو احساس جرم کی طرح دل و دماغ کو لگاتار کچو کے لگاتا رہتا ہے اور اس سے گلو خلاصی کا واحد طریق یہ ہے کہ ''گزشتہ را صلوات'' کے محاورے پر جی جان سے عمل کیا جائے۔

میں مرزا غالب کا کوئی شعر پڑھتا ہوں تو مجھے یوں لگتا ہے جیسے غالب کی پوری شخصیت اُس کے اپنے زمانے کے ابعادِ ثلاثہ کے تناظر میں ایک گرہ بن کر اُبھر آئی تھی۔ خود غالب کی زندگی میں نامساعد حالات کی گرہ کئی نازک موڑوں پر، اُس کے سامنے سینہ تان کر آن کھڑی ہوئی تھی مگر وہ اُسے ہمیشہ ایک متبسّم دیدۂ تر کے ساتھ پار کر گیا تھا۔ دوسری جانب تخلیقی سطح پر گرہ کا وجود، میرزا نوشہ کا بڑا معاون تھا۔ وہ یوں کہ جب بہ وقت نیم شب، اُس پر عالم غیب سے اشعار کا نزول ہوتا تو ساتھ ہی یہ سوال بھی سر اُٹھا لیتا کہ رات کے اُس پہر میں اُن اشعار کو کیوں کر قلم بند کیا جائے ۔ چناں چہ میرزا صاحب ہر تازہ شعر کی آمد پر، اپنے ازار بند میں ایک گرہ لگا لیتے تاکہ انھیں اشعار کی تعداد یاد رہے۔ اگلی صبح بیدار ہو کر، ناشتے سے فراغت پانے کے بعد، مردانے میں تشریف لے جاتے اور قلم دوات لے کر شب رفتہ کے اشعار کو صفحۂ قرطاس پر حروف کی گرہوں کی صورت میں منتقل کرنے لگتے اور ساتھ ساتھ اِزار بند میں لگی گرہوں کو بھی باری باری کھولتے جاتے ۔ خیر، یہ تو ایک شخصی نوعیت کی گرہ کے کھلنے کی مثال تھی۔ آپ تھوڑی دیر کے لیے اپنے اِرد گرد پھیلی زندگی کا مشاہدہ کریں تو آپ کو بخوبی اندازہ ہو جائے گا کہ زمین کی چھاتی پر پھن اُٹھا کر بیٹھے گرانڈیل پہاڑ، محافظوں کے مانند ایستادہ اشجار، تیز رفتار پانی کے منہ پر ہاتھ رکھنے والے ڈیم، سڑک کے کناروں پر باادب باملاحظہ کھڑے ٹریفک سگنل ، اور

قبروں کے کوہان ..... یہ سب کے سب ، گرہوں کے مختلف روپ اور بہروپ ہیں بلکہ اللہ کے تمام بندے معاشی ،لسانی اور سماجی بندھنوں کے حوالے سے ایک دوسرے سے پیوست گرہیں ہیں جن سے مل کر تہذیب کا تنومند گولا معرض وجود میں آتا ہے ..... یہ گولا اپنے اندر اُن لا تعداد الجھنوں کو سمیٹے ہوتا ہے جن کے سرے مختلف نظریات ،تصورات اور افکار کے دھاگوں کی صورت میں باہر کو نکلے ہوتے ہیں۔ اکثر و بیشتر تہذیب کے اِس مہا گولے کی الجھنوں کو سلجھانے والے، اس کی گرہوں میں پھنس کر بے دست و پا ہو جاتے ہیں۔ مطلب یہ کہ معصوم لوگ ،زندگی کی گوناں گوں گرہوں سے تشکیل یافتہ اس پنجرے میں گرفتار ہوتے رہتے ہیں۔ اس پر مستزاد یہ کہ اُن کی گرفتاری ہمیشہ بغیر وارنٹ کے عمل میں آتی ہے اور یہ ایک ایسی پکی گرہ ہے جو کسی طور کھل نہیں سکتی۔ شاید اِسی لیے کہا گیا ہے کہ زندگی کی کچھ گرہوں کا گرہ کی حالت ہی میں رہنا مناسب ہے کہ ان کے کھل جانے سے بہت کچھ تار تار ہو سکتا ہے ۔ مجھے قسمت کا حال بتانے والے جوتشی ،لوگوں کے ذہنوں میں مستقبل کے فرضی خوف سے پڑ جانے والی گرہوں کو کھولنے کا دھندا کرتے معلوم ہوتے ہیں ،اور فی زمانہ یہ دھندا ،اندھا دھند ہو رہا ہے۔ وہ زمانہ لد چکا جب گرہ پر گرہ لگانا کمالِ فن تھا۔ اب تو حال اتنا پتلا ہو چکا ہے کہ لوگوں کو ایک دوسرے کی گرہ ٹٹولنے کے سوا اور کوئی بات سوجھتی ہی نہیں۔

زندگی کے ارتقا میں انسان کا وجود ایک ایسی گرہ بن کر نمودار ہوا ہے جو سب سے انوکھی ، حیرت انگیز اور دلچسپ ہے۔ ہر چند کے حضرتِ آدم کو شجرِ ممنوعہ کی گرہ کھولنے کی پاداش میں زمین پر اُتار دیا گیا تھا مگر یہاں پہنچ کر اُس نے اپنے چاروں طرف رنگ برنگ گرہوں پر مشتمل ایک رنگین جہان تخلیق کر لیا اور اب وہ اس رنگین جہان کی اُلجھی لٹوں کو سلجھاتے سلجھاتے' خود اس قدر الجھ چکا ہے کہ شاید جیتے جی اس کام سے چھٹکارا حاصل نہیں کر سکے گا۔

آخری بات یہ کہ جب ایک صدی' اپنی سانسیں پوری کر لیتی ہے اور اُس کی گرہ کمزور ہو کر' کھُلنے لگتی ہے تو اُس میں بندھا ہوا کُل اثاثہ لڑھک کر اگلی صدی کی گرہ میں جا گرتا ہے۔ ایک صدی کو مختلف ادوار کی گرہوں میں بھی بانٹا جا سکتا ہے جنھیں ہم تاریخ سے موسوم کر سکتے ہیں۔ گویا تاریخ، گرہ کے کھُلنے اور بند ہونے کی ایک مسلسل داستان ہے۔ اس سے قطع نظر کائنات میں تغیر کو نہیں، گرہ کو ثبات ہے کیوں کہ لوگ، نظام اور عہد تو آتے جاتے رہتے ہیں لیکن گرہ ہر زمانے میں موجود رہتی ہے..... ایک ایسی گرہ جسے ''سم سم'' ایسا کوئی خفیہ'' کوڈ ورڈ'' ہی وقت سے پہلے کھول سکتا ہے!!

ڈاکٹر رشید احمد گوریجہ

مسکراہٹ

میرے کمرے کی دیوار پر بہت سے مصوروں کے فن پارے موجود ہیں ان میں اطالوی مصور لیونارڈو کا شاہکار مونا لیزا کی نقل بھی آویزاں ہے۔ مونا لیزا کے کتابی چہرے، ستواں ناک، غزالی آنکھوں کے ساتھ ساتھ جو چیز اس تصویر کو سب سے زیادہ نمایاں اور اہم بناتی ہے وہ مونا لیزا کے لبوں پر بکھری ہوئی مسکراہٹ ہے۔ اس مسکراہٹ کا اثر چہرے کے باقی خدوخال پر بھی پڑا ہے۔ یہ مسکراہٹ کب اور کیوں اس خاتون کے لبوں پر نمودار ہوئی اس کا سراغ نہیں لگایا جاسکا، کیا وہ مصور کی فرمائش پر مسکرائی تھی یا کسی اندرونی مسرت آگیں جذبے کی آسودگی اس کے لبوں پر مسکراہٹ بن کر نمودار ہوئی تھی۔ اس کا سراغ تو کوئی محقق ہی لگا سکتا ہے لیکن یہ ایک طے شدہ امر ہے کہ یہ تصویر صرف مسکراہٹ کی بنا پر امر ہوگئی ہے۔

فن کے قدر شناس اور ناقدر شناس بھی محض اس مسکراہٹ کی بنا پر اسے اپنی دیواروں پر آویزاں کرتے ہیں اس مسکراہٹ کی خوبی یہ ہے کہ یہ ایک سنجیدہ خاتون کی مسکراہٹ لگتی ہے خاتون کے پتلے پتلے نازک سے ہونٹوں کے کنارے پر خم پڑے ہوئے ہیں، ہونٹوں کے کھچاؤ سے آنکھیں بھی مسکراتی ہوئی نظر آتی ہیں بلکہ اس مسکراہٹ کے اثرات پوری تصویر پر نظر آتے ہیں۔

مسکراہٹ کی خوبی یہی ہے کہ اس کے آثار پورے چہرے کو اپنے حصار میں لے لیتے ہیں آدمی اپنے پورے وجود سے مسکراتا ہوا محسوس ہوتا ہے میں مسکراہٹ کو ہنسی کا دیباچہ کہتا ہوں، ہنسی مسکراہٹ کی توسیع ہے اور قہقہہ ہنسی کی تیز پھوار ہے جب ہم اپنی مسکراہٹ پر قابو پانے میں ناکام ہو جاتے ہیں تو ہونٹ تھوڑے سے اور کھل جاتے ہیں اور اندر سے دانتوں کی قطار جھلکنے لگتی ہے۔ ہنسی لبوں کے دروازوں پر دستک ہے اس کے بعد ہنسی کا دروازہ کھلتا ہے۔ مسکراہٹ مہذب لوگوں کا شعار ہے۔ مہذب لوگ ہنسنے کے موقع پر بھی مسکراتے ہیں کیوں کہ ہنسی سے آواز پیدا ہوتی ہے اور قہقہہ سے گونج جنم لیتی ہے اور مہذب لوگ شور پسند نہیں کرتے۔

مسکراہٹ انسان کے اندر خوبصوررت اور پر مسرت جذبوں کے شگوفے کھلنے کا عمل ہے

جس طرح زمین کے سینے کو پھاڑ کر خودرو پوداا پنے وجود کا اعلان کرتا ہے اِسی طرح اندرونی خوشی کا اظہار لبوں پر مسکراہٹ بکھیر کر کیا جاتا ہے۔

مسکرانا دنیا کا سب سے مشکل کام ہے،بعض اوقات طبیعت پر جبر کر کے بھی مسکرانا پڑتا ہے ایسی مسکراہٹ دبی دبی سی ہوتی ہے اور دیکھنے والا صاف محسوس کر لیتا ہے کہ مسکرانے والا مجبوراً مسکرار ہا ہے۔خواتین ناول نگار ایسی مسکراہٹ کو زخمی مسکراہٹ قرار دیتی ہیں۔ جب آدمی اندر سے کرچی کرچی ہوتا ہے تو وہ اپنے حالات پر بے رحمی اور تلخی سے مسکراتا ہے،اگر مریض تیمارداروں کے سامنے مسکرائے تو سمجھا جاتا ہے کہ بیمار کا حال اچھا ہے۔

ایک مسکراہٹ تصویر کھنچواتے وقت بھی لبوں پر لائی جاتی ہے مسکراہٹ ریموٹ کنٹرول ہوتی ہے اور فوٹوگرافر کے لبوں سے نکلنے والے الفاظ سے بندھی ہوتی ہے۔ جوں ہی اس کے منہ سے الفاظ نکلتے ہیں'' پلیز !ذرا مسکرایے'' فوٹو کھنچوانے والے کے لبوں پر مسکراہٹ بکھر جاتی ہے یہ زبردستی کی مسکراہٹ ہوتی ہے۔ اس میں تصنع ہوتا ہے، بناوٹ والی یہ مسکراہٹ ملاوٹ سے پاک نہیں ہوتی۔ ہمارے سیاست دان اور بیوروکریٹ اپنے لبوں پر یہ مسکراہٹ اس وقت بکھیرتے ہیں جب وہ کسی تقریب میں عوام سے مِل رہے ہوں الیکشن کے موقع پر بھی سیاست دانوں کے لبوں پر یہی مسکراہٹ ہوتی ہے۔

یہ سراغ لگانا بہت مشکل ہے کہ پہلے پہل مسکراہٹ کب اُبھری،ممکن ہے پہلی مسکراہٹ اُس کے ہونٹوں پر اُبھری ہو جسے سجدہ نہ کرنے کے جرم میں لعنت کا طوق پہنایا گیا تھا۔مگر یقین ہے کہ یہ طنزیہ مسکراہٹ ہوگی۔ اِسی لیے جس مسکراہٹ میں طنز واستہزا ہو اِسے شیطانی مسکراہٹ کہتے ہیں۔

کئی اشخاص کے چہروں پر ایسی مسکراہٹ اُبھرتی ہے کہ اُن پر مر مٹنے کو جی چاہتا ہے جب کہ بعض افراد کے چہروں کی مسکراہٹ مرنے مارنے پر آمادہ کر دیتی ہے۔ پہلی قسم کی مسکراہٹ دو چاہنے والوں کے لبوں پر اور دوسری قسم کی مسکراہٹ دو رقیبوں کے لبوں پر نمودار ہوتی ہے۔

ہم مسکرانے والے لوگوں کو پسند کرتے ہیں روتے بسورتے لوگ کسی کو پسند نہیں آتے البتہ ہنستے مسکراتے لوگوں کی محفل سب پسند کرتے ہیں ۔بچوں اور بڑوں کی مسکراہٹ میں بھی فرق ہے ۔بچوں کی مسکراہٹ ریاکاری سے پاک اور معصومیت سے مملو ہوتی ہے۔انھیں پتا نہیں ہوتا کہ کب مسکرانا ہے اور کب سنجیدہ ہونا ہے۔ وہ انتہائی غم انگیز ماحول میں بھی مسکرا اُٹھتے ہیں۔ جب کہ بڑوں کو پتا ہوتا ہے

کہ رونے کے موقع پر مسکراہٹ کے کیا نتائج نکل سکتے ہیں اِسی طرح اگر وہ کسی ناپسندیدہ شخص سے مل رہے ہوں تو بھی لبوں پر منافقانہ مسکراہٹ لے آتے ہیں۔

مزے دار لطیفہ سن کر یا اخبار میں کوئی سیاسی سماجی کارٹون دیکھ کر ہمارے اندر گدگدی پیدا ہوتی ہے اور ہم پھر مسکرانے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔ دراصل معاشرتی زندگی کی کوئی ناہمواری ہمارے اندر احساسِ برتری پیدا کرتی ہے اور ہم مسکرانے لگتے ہیں کہتے ہیں کہ رونے والوں کے ساتھ کوئی نہیں روتا مسکرانے والوں کے ساتھ مل کر سب ہنستے ہیں۔ ہنسی تھکے ہوئے اعصاب کے لیے ٹانک کا درجہ رکھتی ہے۔

آپ تصور کریں کہ آپ دن بھر کی مشقت اور دفتری معمولات کی یکسانیت سے اُکتا کر گھر آتے ہیں گھر کی دہلیز پر آپ کی بیوی مسکرا کر آپ کا استقبال کرتی ہے اس کے لبوں کی مسکراہٹ آپ کے دل کی کدورت اور دن بھر کی تھکاوٹ کو دور کر دے گی لیکن اگر وہ جبیں پر شکن ڈال کر یا روتی بسورتی شکل سے آپ کا استقبال کرے تو آپ کی کوفت بڑھ جائے گی۔

باغوں میں پھول مسکراتے اچھے لگتے ہیں۔ اِسی لیے پھولوں کی مسکراہٹ سے لطف اندوز ہونے کے لیے لوگ موسمِ بہار میں باغوں کی سیر کو جاتے ہیں۔ خزاں کا موسم مسکراہٹوں کے لیے جان لیوا ہوتا ہے۔ مسکراہٹ دوستوں کو دیکھ کر از خود لبوں پر بکھر جاتی ہے جب کہ دشمنوں کو دیکھ کر کبھی کوئی شخص نہیں مسکراتا۔ دشمن کو دیکھ کر چہرے کے نقوش پر تنفر آمیز کھچاؤ پیدا ہوتا ہے۔ مسکراہٹ چاندنی کی طرح ہوتی ہے اس کی ہر کرن جان افزا ہے۔

ماں جب تخلیقی عمل سے گزرتی ہے اور اس کے پہلو میں نوزائیدہ بچہ پہلی چیخ مارتا ہے تو ماں کے لبوں پر مسکراہٹ بکھر جاتی ہے یہ مسکراہٹ اس بات کا علامتی اظہار ہے کہ بچے نے اپنے ہونے کا ثبوت دیا ہے۔ بعد ازاں جب بچہ رونے کے مراحل کو عبور کر کے مسکرانے کے مرحلے میں داخل ہوتا ہے تو گویا انسانیت کے مدار میں اپنا پہلا قدم رکھتا ہے۔ پھر یہ مسکراہٹ آہستہ آہستہ شگفتنِ گل کا منظر دکھاتی ہے۔ تا آں کہ ایک روز عرفان کے مدار میں داخل ہو جاتی ہے۔ عرفان کی یہ مسکراہٹ سب سے بڑی انسانی یافت ہے۔

☆☆☆☆

انجم نیازی

نادانی

میں علم الانساب کا ماہر تو نہیں ہوں مگر میرا خیال ہے کہ نادانی کا نسبی تعلق نمک دانی اور چائے دانی کے قبیلے سے ہوگا۔ میں نے کئی بار نادانی کے طول و عرض پر غور کیا ہے اس کے ناک نقشے کو کئی بار پلکیں جھپک جھپک کر دیکھا ہے اور ہاتھوں سے ٹٹولا ہے، ہر بار مجھے اس کے اندر ایک ننھا مُنا معصوم سا لفظ دکھائی دیا ہے اور اس کا وجود بے ضرر محسوس ہوا ہے جو باہر کی دنیا کو ایک بھولے بھالے دیہی بچے کی طرح دیکھ رہا ہو۔ نادانی کے لفظ کو چھونے سے میری انگلیوں کو کوئی کانٹا نہیں چُبھا' آنکھوں میں کسی قسم کی جلن محسوس نہیں ہوئی، حالاں کہ لغت میں ایسے ایسے گرانڈیل لفظ موجود ہیں جنھیں دیکھ کر آنکھیں خوف سے اندر دھنس جاتی ہیں اور چھونے سے انگلیوں کی پور پور جلنے لگتی ہے۔ ایسے لفظوں کی نشاندہی کرنا اس لیے ممکن نہیں کہ ان کے پیچھے دہشت کے کئی راستے کھُلتے ہیں جن کے ہر موڑ پر خوف ناک لوگ پہرا دے رہے ہوتے ہیں۔ میں ایک پُر امن شہری (جسے عرفِ عام میں بزدل کہا جاتا ہے) کے طور پر باعزت طریقے سے زندگی کے چند سال اور بسر کر لینا چاہتا ہوں کیوں کہ امن اور عزت موجودہ دور میں بہت مہنگی چیزیں ہیں' جو باآسانی میسر نہیں آسکتیں اور نہ ہی انھیں سبزی گوشت کے بھاؤ خریدا جاسکتا ہے۔ عزت حاصل کرنے کے لیے آپ کے پاس فائیو ڈور (Five Door) پجارو، ایک عدد موبائل فون اور ایک بڑی کوٹھی بلکہ کوٹھا ہونا چاہیے اور ان کی حفاظت کے لیے دو چار لمبی لمبی مونچھوں اور لمبے لمبے بازوں والے روبوٹ نما باڈی گارڈ ضروری ہیں' ورنہ میری طرح چُھپ چُھپ کر اور ڈر ڈر کر زندہ رہنا پڑے گا۔ کسی ڈاکو کو ڈاکو اور چور کو چور کہنے سے گریز کرنا ہوگا۔ لغت کے اندر اس قسم کے باعزت لوگوں کے لیے جتنے خوفناک لفظ موجود ہیں' اُن کا احترام کرنا ہوگا۔

تاہم آپ کو لفظوں کے ساتھ چھیڑ چھاڑ کا شوق پورا کرنا ہی ہے تو نادانی اور بے وقوفی ایسے سینکڑوں لفظ موجود ہیں جن کے ساتھ اس مشغلے کو جاری رکھا جاسکتا ہے.....یہی الفاظ' میری آپ کی ملکیت ہیں' اِنھیں کی انگلی پکڑ کر چلنا ہے۔

دوسری بات یہ ہے کہ بہت سے الفاظ' انسانوں کی طرح منافق اور دھوکے باز ہوتے ہیں۔۔۔۔اندر سے کچھ' باہر سے کچھ، مگر نادانی کا لفظ مردِحق کی طرح اندر باہر سے ایک جیسا ہوتا ہے (مردِحق بھی وہ' جو ہر وقت اپنا نقصان کرنے پر بضد ہو)۔

دراصل نادانی نمک دانی اور چائے دانی کی طرح بے لوث لفظ ہے۔آپ کہہ سکتے ہیں کہ نمک دانی اور چائے دانی اپنا اپنا الگ تشخص رکھتی ہے' ان کا اپنا اپنا الگ وجود ہے۔اوران کے اندر سے الگ الگ اشیا برآمد ہوتی ہیں.....نمک دانی میں سے نمک اور چائے دانی میں سے چائے۔پھر چائے دانی کو دیکھتے ہی انسان کے اندر چائے پینے کی خواہش کرنٹ کی طرح دوڑ جاتی ہے، اور نمک دانی کو دیکھتے ہی منہ کا ذائقہ خود بخود نمکین ہو جاتا ہے، مگر نادانی کا کوئی ٹھوس وجود ہوتا ہے نہ اس کے اندر سے کوئی مائع گیس قسم کی چیز برآمد ہوتی ہے.....تو پھر اس کا چائے دانی اور نمک دانی سے کیا رشتہ باقی رہ جاتا ہے.....ارے بھائی' رشتے مال گاڑی کے ڈبے تو نہیں کہ ایک دوسرے سے جڑے ہوئے نظر آئیں اور ایک دوسرے کو کھینچتے دکھائی دیں۔بعض رشتے ایسے بھی ہوتے ہیں جو لفظوں سے جڑتے اور لفظوں سے ہی ٹوٹ جاتے ہیں۔ایک غیر مرد اور غیر عورت' میاں بیوی بننے سے پہلے صرف ایک لفظ زبان سے ادا کرتے ہیں اور اُس ایک لفظ کا استعمال کر لینے کے بعد آپس میں یوں نتھی ہو جاتے ہیں کہ عمر بھر ایک دوسرے سے جان نہیں چھڑا سکتے۔

دور کیوں جائیں "کُن" بھی ایک لفظ ہی تھا جس کے اندر سے اتنی بڑی کائنات' ایک دھماکے کے ساتھ یوں باہر آئی کہ اب اُس لفظ کے اندر جانے کے لیے کسی طرح بھی تیار نہیں۔

نادانی کے جواز پر کوئی سیاسی یا غیر سیاسی بحث نہیں ہو سکتی کیوں کہ بحث ہمیشہ مسائل کو الجھانے کے لیے کی جاتی ہے، اُن کا حل تلاش کرنے کے لیے ہرگز نہیں۔تاریخ گواہ ہے کہ کوئی مسئلہ بحث سے کبھی حل نہیں ہوا' اس لیے میں آپ کو بحث میں الجھا کر اپنا اور آپ کا قیمتی وقت ضائع نہیں کرنا چاہتا۔یہ الگ بات کہ نہ تو آپکا وقت قیمتی ہے اور نہ ہی میرا۔جن کا وقت قیمتی ہوتا ہے' وہ اُسے فٹ پاتھوں اور گلی کوچوں میں گرد اُڑا کر ضائع نہیں کرتے چنگیز خان کی مثال سامنے ہے۔اُس کا وقت قیمتی تھا۔وہ اپنے مخالفین سے لمبی چوڑی بحث میں اُلجھنے کے بجائے' اُنھیں مولی گاجر کی طرح کاٹ کر رکھ دیتا تھا.....بحث و تکرار میں اپنا وقت ضائع کرتا نہ مرنے والوں کا!۔

عالمِ محسوسات میں بھی نادانی کا وجود ثابت کیا جا سکتا ہے رہی یہ بات کہ اس کے اندر سے کیا

کچھ برآمد ہوتا ہے یا ہو سکتا ہے' تو اِس کا مختصر اور سادہ سا جواب یہ ہے کہ اس کے اندر سے خواہ ہاتھی برآمد ہو خواہ چیونٹی' اس سے کچھ فرق نہیں پڑتا۔ نادانی کے اندر باہر' اور اس کے ہر طرف سے نادانی ٹپکتی ہے۔ پیاز کی طرح اس کے جتنے بھی چھلکے اُتاریں' ہر چھلکے سے نادانی کی بو باس برآمد ہوتی ہے۔ اس کی پہلی تہ سے آخری تہ تک یہی سلسلہ جاری رہتا ہے۔ نادانی کو جتنے فاصلے سے دیکھیں' جتنی بار دیکھیں' آپ کو نادانی کے سوا کچھ نظر نہیں آئے گا۔

بڑے لوگوں کا خیال ہے کہ نادانی کا لفظ چھوٹے چھوٹے لوگوں کے چھوٹے چھوٹے دماغوں میں اُگتا اور پروان چڑھتا ہے۔ چھوٹے لوگ بضد ہیں کہ نادانی بڑے بڑے بنگلوں اور بڑی بڑی خوابگاہوں کی زینت ہوتی ہے..... بڑی بڑی کاروں کی ہیڈ لائٹ (Head Light) بن کر چمکتی ہے۔ میری ذاتی رائے یہ ہے کہ دونوں جھوٹ بولتے ہیں۔ نادانی ہر شخص کے ساتھ ساتھ سفر کرتی ہے اور پاس پاس رہتی ہے۔ انسانی تاریخ گواہ ہے کہ بڑے بڑے فلسفی اور دانشور اس کے سائے میں زندگی بسر کرتے رہے ہیں' بڑے بڑے فاتح اِسے شکست دینے میں ناکام رہے ہیں۔ ہر شخص کہیں نہ کہیں اور کسی نہ کسی شکل میں اس کے آگے سپر انداز ہوتا رہا ہے..... کوئی جنگ جیتنے کے بعد اور کوئی ہارنے کے بعد۔

جب داناؤں پر نادانی کا دورہ پڑتا ہے تو وہ نادانوں کو بھی پیچھے چھوڑ جاتے ہیں...... ایسی ایسی احمقانہ حرکتیں کر گزرتے ہیں کہ احمق بھی قہقہے لگانے لگتے ہیں۔ رہا چھوٹے لوگوں کا دعویٰ تو ان کے بارے میں یہی کہا جا سکتا ہے کہ کیا پدّی اور کیا پدّی کا شوربا...... اُن کی کسی بات کی کوئی اہمیت نہیں۔ جب اُن کی اپنی کوئی حیثیت نہیں تو اُن کی بات کی کیا حیثیت باقی رہ جاتی ہے..... اگر اُن کی کوئی حیثیت ہوتی تو وہ تنگ گلیوں میں کیڑے مکوڑوں کی طرح رینگتے نہ رہتے۔ مجھے اپنی سرکاری حیثیت میں (میری ذاتی حیثیت متنازع ہے) جب کبھی کسی بڑی کانفرنس میں شرکت کا موقع ملا' تو مجھے تھری پیس (Three Piece) سوٹوں' خوبصورت نکٹائیوں اور پُر وقار واسکٹوں میں نادانی کے پہاڑ چہل قدمی کرتے نظر آئے۔ ایسے میں کاروں پر لہراتے جھنڈے اور محافظوں کے ہاتھوں میں مضبوطی سے پکڑے ہوئے ڈنڈے' نادانی کی طرف پیش قدمی کرتے دکھائی دیتے ہیں کیوں کہ طاقت کا ہر قدم نادانی کی طرف اُٹھتا ہے اور ہر سفر نادانی پر ختم ہوتا ہے۔

سکندرِ اعظم' اپنے عہد میں طاقت کا سرچشمہ تھا۔ مقدونیہ سے جہلم تک کوئی پہاڑ، کوئی دریا اور کوئی صحرا اس کا راستہ نہ روک سکا۔ مگر جب اُس کے اندر سے نادانی کا آتش فشاں پھٹنا شروع ہوا تو وہ

ایک معمولی مچھر کی طرح موت کی مچھر دانی میں جا اٹکا۔ اُس نے مرنے میں اتنی دیر لگائی جتنی دیر میں مچھر آخری سانس لیتا ہے۔ مچھر تو پھر بھی آخری بار اپنے پَر جھاڑنے اور کسی چیز سے ٹکرانے کا حق استعمال کر جاتا ہے! مگر اتنا بڑا فاتح جس کے خوف سے تاریخ کے صفحات سہمے ہوئے ہیں' مچھر کے برابر بھی جرأت کا مظاہرہ نہ کر سکا۔ دوسروں کی خواہشات پوری کرنے کا دعویٰ کرنے والا، دنیا کو فتح کرنے کی چھوٹی سی خواہش بھی پوری نہ کر سکا۔ اگر میں اُس کے عہد میں ہوتا تو اُس بے وقوف آدمی سے کہتا:

''میاں تمھیں کیا تکلیف ہے.....موت کا کھیل کھیلنے کے لیے اتنے طویل سفر کی صعوبت اُٹھانے کی کیا ضرورت ہے......یہ سہولت تو اپنے ملک بلکہ اپنے گھر میں با آسانی حاصل کی جا سکتی ہے ......ضروری تو نہیں کہ دس ہزار میل دور جا کر' یہ ناخوشگوار فرض ادا کرنے کے لیے کسی اجنبی شخص کو یہ زحمت دی جائے کسی کو راہ چلتے پریشان کیا جائے! اس کے لیے اپنے ہی کسی جرنیل یا اپنے ہی کسی نوکر کا خنجر استعمال کیا جا سکتا ہے۔ اگر خنجر کے ساتھ ہاتھوں کی ضرورت پڑ جائے تو اپنوں ہی کے ہاتھ استعمال کیے جا سکتے ہیں۔ اگر کسی خوبصورت خادمہ کی انگلیوں کو سینے پر پھیرنے سے موت واقع نہ ہو سکے تو انگلیوں کو گردن تک پہنچنے کی اجازت دی جا سکتی ہے۔ اسطرح دونوں کا کام مکمل اور خواہش پوری ہو جائے گی!۔''

میرا خیال ہے کہ اس قسم کی موت اُس موت سے کہیں زیادہ خوبصورت ہوگی۔ کسی اُجڈ' گنوار شخص کے خنجر سے مرنے کے بجائے کسی خوبصورت عورت کے ملائم ہاتھوں سے مرنے کی سعادت حاصل کرنا ہزاروں دانائیوں سے بہتر ہے۔ مگر افسوس، سکندر کو ارسطو ایسے بدذوق مشیر ملتے رہے، جنھوں نے اپنے اوپر نادانیوں کے غلاف چڑھا رکھے تھے' اور جو اپنے آپ کو فلسفی کہلانے پر ضد کرتے تھے!

ویسے تو ہر دور کے فلسفی اور دانشور' نادانیوں کی دلدل میں گھٹنوں گھٹنوں دھنسے ہوئے ہیں۔۔۔۔ وہ جو بھی سائنسی یا غیر سائنسی نظریہ پیش کرتے ہیں' اُسے تسلیم کرانے کے لیے ایڑی چوٹی کا زور لگا دیتے ہیں، مگر اُن کے بعد آنے والے اُن کے نظریات کو نہ صرف غلط ثابت کر دیتے ہیں بلکہ دنیا میں ان کا مذاق بھی اُڑاتے ہیں۔ اگر ایسے دانشور ایک بار اِس دنیا میں لوٹ کر آ سکتے اور اپنے نظریات کا چُورن بنتے دیکھ لیتے تو مارے شرم کے اپنے کفن پھاڑ کر بھاگ کھڑے ہوتے۔

لوگوں کی اس بھیڑ میں' ہر شخص اس کوشش میں ہے کہ نادانیوں کے ہجوم میں وہ اپنی زندگی میں اپنے پیچھے ایسی نادانی چھوڑ جائے کہ صدیوں تک تاریخ میں اُس کی مثال پیش نہ ہو سکے اور عالمِ انسانیت

اُسی کی ایک نادانی کے آگے قیامت تک سجدہ ریز رہے۔ اس ایک مقصد کے لیے انسان نے کتنی ہی نئی نئی تجربہ گاہیں (Laboratories) قائم کر رکھی ہیں۔ انسان کی نادانیاں ایٹم بموں اور میزائلوں کی صورت میں آئے دن انسان ہی کو پریشان کرتی رہتی ہیں۔ جب ان نادانیوں کا جن بوتل سے باہر آجاتا ہے تو پھر اُسے دوبارہ بوتل میں بند کرنے کی کوشش شروع ہو جاتی ہے، مگر جنیوا سے لے کر ہانگ کانگ تک نادانیوں کو جن کے سائز کی بوتل دستیاب نہیں ہوتی کہ اُسے بند کیا جا سکے۔

اگر مجھے کہا جائے کہ انسان کے جرائم کی چارج شیٹ تیار کروں تو میں لمبے چوڑے الزامات لگانے اور گواہ اکٹھے کرنے کے بجائے صرف ایک الزام لگا کر چارج شیٹ کو سربہ مہر کر دوں کہ انسان جس قدر دانا دکھائی دیتا ہے' اُس سے کئی زیادہ نادان ہے...... اِسے نادان ثابت کرنے کے لیے اسکا اپنا وجود اور علم ہی کافی ہے۔

انسان میں ذرہ برابر بھی عقل ہوتی تو دنیا میں آنے کا نام تک نہ لیتا۔ پیدا ہونے سے انکار کر دیتا تو کم از کم اس دنیا میں اُس کی نادانیوں کا بھانڈا تو نہ پھوٹتا۔ مگر مجھے یقین ہے کہ یہ لوگ اُس دنیا میں رہتے ہوئے بھی اس قدر شور مچاتے کہ ان کی بے وقوفیوں اور نادانیوں کی بازگشت صدیوں کے سفر کے بعد بھی اِس دنیا میں پہنچ جاتی۔

انسان نادانیوں کی چلتی پھرتی نشرگاہ ہے۔ اس کے ہاتھوں، کانوں اور ٹانگوں سے نادانی کے پیغامات نشر ہوتے رہتے ہیں۔ انسان اپنی تمام تر نادانیوں کو کتابوں میں محفوظ کر لیتا ہے اور انھیں شیشے کی الماریوں میں سجا دیتا ہے جنھیں وہ لائبریریوں کا نام دیتا ہے۔ اُس کے نزدیک نادانیوں کے یہ ذخیرے علم کے موتی ہیں جنھیں وہ کھا سکتا ہے نہ چبا سکتا ہے۔ ہر کتاب' دوسری کتاب کی تردید کرتی ہے۔ ہر وصف' دوسرے وصف کا مذاق اُڑاتا ہے۔ دنیا بھر کے دانشور، آج تک کسی ایک بات پر بھی متفق نہیں ہو سکے، مگر وہ دوسروں کو متفق اور متحد ہونے کا درس دیتے دیتے اِس دنیا کی سرحد کو پار کر جاتے ہیں۔

جب تک میں نے کسی سکول کی دہلیز پر قدم نہیں رکھا تھا اور کوئی لفظ نہیں پڑھا تھا' میں بہت کچھ جانتا تھا...... مجھ پر سربستہ راز منکشف ہوتے رہتے تھے اور مجھے ہر وقت آگہی کی خوشبو گھیرے رکھتی تھی۔ مگر جب سے میں نے لکھنے پڑھنے کی صلاحیت حاصل کی ہے مجھے محسوس ہوتا ہے کہ میرے لیے آگہی کے سب دروازے بند کر دیے گئے ہیں۔ مجھے نادانیوں کے سمندر میں دھکیل دیا گیا ہے۔ مجھے ہر کتاب بے حرف دکھائی دیتی ہے۔ مجھے ہر خبر' بے خبری کے الاؤ میں جھونک رہی ہے۔ میں محسوس کرتا

ہوں کہ آگہی کی نسبت نا آگہی کا سفر زیادہ پرلطف اور آسان ہوتا ہے۔ میرا علم' میری نادانیوں کے شعلوں کو اور زیادہ ہوا دے رہا ہے اور میرے اپنے لکھے ہوئے الفاظ میرا مذاق اُڑا رہے ہیں۔ کاش لفظوں اور نادانیوں سے میری آشنائی نہ ہوئی ہوتی' کاش میں کچھ نہ جانتا اور اگر کچھ جانتا تو یہ ہی کہ میں کچھ نہیں جانتا!۔

ایک دروازہ

مجھے اب تک بھی یہ اندازہ نہیں ہو پایا کہ وہ دروازہ راستہ چلتے ہوئے کہاں سے آ گیا تھا، میں جس جادے پر سفر کر رہا تھا وہ ایک ہموار اور چٹیل میدان تھا، جس میں کوئی عمارت یا کوئی فصیل نہیں تھی، پھر اچانک مجھے یوں لگا کہ میرے سامنے ایک مٹیالے سے رنگ کا خستہ حال دروازہ ہے اور میں اس کی طرف کھنچا چلا گیا، پھر وہ دروازہ مجھ پر کھل گیا اور میں بے جھجک اس کے اندر داخل ہو گیا، بس اندر داخل ہونے کی دیر تھی کہ پورا منظر یکسر تبدیل ہو گیا اب چاروں طرف اندھیرا ہی اندھیرا تھا اور یہ اندھیرا بارش کی صورت میں برس رہا تھا اور میں اس اندھیرے میں بھیگتا چلا جا رہا تھا، تھوڑی دیر میں مجھے محسوس ہونے لگا کہ میں بالکل شرابور ہو گیا ہوں، اندھیرے کی سیلن میری ہڈیوں میں سرایت کر گئی ہے، پھر مجھے یہ یخ بستہ اندھیرا خون میں شامل ہوتا ہوا محسوس ہوا، مجھے لگا کہ وہ میری رگوں میں سر ک رہا ہے، خون کے سُرخ ذرّوں اور سفید ذرّوں میں اب کچھ سیاہ دھبے بھی تیرتے ہوئے دکھائی دے رہے تھے اور آہستہ آہستہ مجھے اپنا سانس گھٹتا ہوا محسوس ہونے لگا تھا۔

وہاں کچھ عجیب طرح کی تنہائی تھی، اس میں کوئی آشنا چیز موجود نہیں تھی مگر نامانوس چیزیں اس قدر زیادہ تھیں کہ ہر لمحہ میں خود کو زیادہ سے زیادہ اجنبی اور تنہا محسوس کرتا چلا جا رہا تھا، ان ناپاک اور نامانوس چیزوں میں کسی نے بھی میری طرف بڑھنے کی کوشش نہ کی مگر میں چاہتا تھا کہ وہ سب ایک ہی بار مجھ پر حملہ آور ہو جائیں اور میری تکا بوٹی کر دیں، ایک لمحے کے لیے میں نے خود کو بکھرتے اور ریشوں میں تقسیم ہوتے دیکھا تھا، پھر مجھے یہ لگا تھا کہ میں اس نامانوس شے کا بنا ہوا ہوں، جسے میں نے اب اندھیرا کہنا شروع کر دیا ہے، وہ کیا چیز تھی جو اس قدر نامانوس، کراہت انگیز، اور ناخوشگوار لگنے کے باوجود میرے وجود ہی کا کوئی حصہ محسوس ہوتی تھی، مجھے یوں لگا تھا جیسے میں صدیوں پہلے اسی جگہ تخلیق کیا گیا ہوں اور مجھے خلق کرتے وقت جو مواد استعمال کیا گیا ہے وہ نہایت تاریک اور کثیف ہے۔

مجھے محسوس ہو رہا تھا کہ گویا میں صدیوں تک وہاں کھڑا رہا ہوں اور تاریک خیالات کا ایک

سیلاب میرے اردگرد ایک فصیل بنائے ہوئے ہے ایک ایسی فصیل جس کا کوئی دروازہ نہیں ہے' پھر اچانک مجھے محسوس ہوا کہ دروازے کو توڑتی ہوئی ایک کرن میری طرف بڑھ رہی ہے' میں دہشت سے چیخ اُٹھا۔ میرے لیے کسی صورت میں یہ ممکن نہیں تھا کہ میں اس کرن کو روک سکوں، مجھے واضح طور پر یہ محسوس ہو رہا تھا کہ اگر یہ کرن مجھے چھو گئی تو میں بھسم ہو جاؤں گا اور میری خاک تک باقی نہ رہے گی۔

پھر وہ کرن میرے سینے کے اندر داخل ہوئی اور مجھے کاٹتی ہوئی یوں گزر گئی جس طرح گرم پانی کی دھار برف کی سِل میں سوراخ کرتی ہوئی گزر جاتی ہے میرے سینے میں دو دراڑیں پیدا ہو چکی تھیں اور ان میں سے اندھیرا آہستہ آہستہ باہر گر رہا تھا جیسے کولتار کے گرم ڈرم سے لُک باہر گرتی ہے، مجھے یوں لگ رہا تھا کہ میں اندر سے خالی ہوتا چلا جا رہا ہوں' مگر اب مجھے سانس لینے میں آسانی محسوس ہونے لگی تھی۔ میرے سینے کے اندر ایک خلا پیدا ہو گیا تھا، جسے بھرنے کے لیے صحرا کی خشک ہوا آندھی کی طرح آ گئی تھی' اب میرے اندر روشنی اور اندھیرے کی لڑائی کے ساتھ ساتھ، خشک ہوا اور نم دار فضا کی لڑائی بھی جاری تھی۔ اندھیرے کی بارش رُک گئی تھی، آسمان آہستہ آہستہ صاف ہوتا چلا جا رہا تھا، کہیں کہیں ستارے نظر آنے لگے تھے، مگر ان ستاروں کے درمیان فاصلے فاصلے پر ایک سیاہ آنکھ مجھے گھورنے لگی تھی، مجھے محسوس ہو رہا تھا کہ میں زندگی کے اس دور میں داخل ہو گیا ہوں جہاں رنگوں کا کوئی وجود سرے سے تھا ہی نہیں، صرف سیاہی تھی اور روشنی تھی' یوں لگتا تھا کہ کوئی ڈراؤنی بلیک اینڈ وائٹ فلم چل رہی ہے۔ اس فلم کا ہر فریم بے حرکت تھا مگر یہ تمام بے حرکت فریم یکے بعد دیگرے ظاہر ہو کر ایک تیز رفتار حرکت پیدا کر رہے تھے' اور میں اس سیلاب میں بہتا چلا جا رہا تھا۔

میرے لیے دو سیلاب بیک وقت موجود تھے ایک سیلاب آسمان پر تھا جس میں ستارے حبابوں کی طرح دکھائی دیتے تھے اور دوسرا سیلاب میرے اندر تھا جس میں حباب ستاروں کی طرح لگتے تھے' میں چکی کے اُن دو پاٹوں میں پس رہا تھا اور ریزہ ریزہ ہو کر مُشتِ خاک کی طرح اُڑنے کو پر تول رہا تھا۔ ہوا تیز چل رہی تھی' پانی آہستگی سے بہہ رہا تھا، سطح پر اپنے آپ لہریں سی ہویدا ہو رہی تھیں جو بنتی کم تھیں اور ٹوٹتی زیادہ تھیں۔

اندھیرے کی دیوار اگرچہ ٹوٹ رہی تھی' اس میں اتنے روزن پیدا ہو گئے تھے کہ اب روشنی کا احساس ہونے لگا تھا مگر اندھیرے کی بارش وقفوں وقفوں سے اب بھی جاری تھی، میں جس لباس میں تھا وہ اب بھی گیلا تھا اور میری ہڈیاں ابھی تک اس سیلن کو محسوس کر رہی تھیں جس میں، میں ڈوبا ہوا تھا۔

اس دُھندلائی ہوئی روشنی میں، میں نے دیکھا کہ زمین پر ایک کریہہ النظر مخلوق سرک رہی ہے، معلوم نہیں کیا وجہ تھی مجھے اس سے خوف نہیں آیا، میں لرز تو رہا تھا مگر اس کی وجہ سردی کا احساس تھا خوف نہیں تھا، کبھی کبھی تو مجھے محسوس ہوتا تھا کہ اگر یہ جاندار میرے قریب آ جائے اور مجھ سے لپٹ جائے تو اندر حرارت جاگ اُٹھے گی،

اب حرارت میرا مقصود تھی، میری آرزو تھی، ہم گرمی تو کسی نہ کسی طرح برداشت کر لیتے ہیں مگر سردی کا احساس ہمیں بے بس کر دیتا ہے۔ سردی، سرد مہری، تنہائی، بیگانگی، یہ سب ایک ہی قبیل کے لفظ ہیں، اور میری ان لفظوں سے دیرینہ آشنائی ہے۔ شاید ایسا ہی کوئی لفظ انسان کے لیے بھی استعمال ہوتا ہو، انسان کے معانی بھی شاید کسی بے وارث شے کے ہوں۔ اسی لیے تو اسے دوزخ کی نوید سنائی گئی ہے اور وہ اپنے تمام اعمال سے یہی ظاہر کرتا ہے کہ اُسے دوزخ ہی کی تلاش ہے۔ انسان اندھیرے کی سیلن کو برداشت نہیں کر سکتا مگر حرارت اور روشنی کی ہر مقدار کو گوارا کر لیتا ہے۔ بلکہ ان کا متلاشی رہتا ہے۔

یہ باتیں جو میں نے آپ سے بیان کی ہیں، مجھ پر اس لمحے یا اس صدی میں منکشف ہوئی تھیں جب میں نے چلتے چلتے ایک دروازے کو دریافت کیا تھا۔ یا یہ بھی ممکن ہے کہ دروازے نے مجھے ڈھونڈ نکالا ہو، میں اب اس دروازے کی دوسری طرف ہوں، جہاں آپ کھڑے ہیں وہ دروازے کا اُلٹا رُخ ہے، یہ دروازہ جو بند ہو چکا ہے، کب کھلے گا، کیوں کھلے گا میں کچھ نہیں کہہ سکتا، ممکن ہے کبھی نہ کھلے اور یہ بھی ممکن ہے کہ جب میں اپنے سامنے پڑے ہوئے کاغذ سے نگاہ اوپر اُٹھاؤں تو وہ دروازہ موجود ہی نہ ہو، جس طرح میں آپ کے لیے موجود نہیں ہوں، بس ایک کاغذ پر چند الفاظ لکھے ہوئے ہیں مگر اس بات کی کوئی ضمانت نہیں کہ الفاظ کس کے ہیں، الفاظ تو ویسے بھی کسی کے نہیں ہوتے حالاں کہ سب لوگ یہی سمجھتے ہیں کہ جو لفظ وہ ادا کر رہے ہیں وہ اِنھیں کے ہیں، ہم جس کائنات میں رہتے ہیں، وہ ہماری ہے، کیوں کہ ہم محسوس کرتے ہیں کہ وہ ہماری ہے مگر کائنات کے حوالے سے دیکھا جائے تو ہمارا موجود ہونا یا نہ ہونا آخر کس اہمیت کا حامل ہے۔ ہم فلسفیوں کی طرح یہ تو سوچ نہیں سکتے کہ یہ جہان اس لیے موجود ہے کہ میں اِسے دیکھ رہا ہوں، یہ بھی تو کہا جا سکتا ہے کہ اگر مجھے کوئی نہیں دیکھ رہا تو میں بھی ناموجود ہوں، آخر موجود ہونے یا نہ ہونے میں فرق تو آگہی کا ہے اور آگہی ایک نامحسوس چیز ہے، کئی بار ہمیں آگہی ہوتی ہے مگر ہم اس کے بارے میں کوئی شعور نہیں رکھتے، یہ وہ مقام ہے جس سے لاشعور کی اتھاہ وسعتیں متعلق ہیں۔ کون کہہ سکتا ہے کہ وہ دروازہ جس میں، میں داخل ہوا ہوں موجود تھا، اور اگر وہ موجود نہیں تھا

جن احساسات کو میں نے بیان کیا ہے، مجھ پر کس طرح وارد ہوئے تھے، کبھی کبھی مجھے لگتا ہے کہ ہمارا معلوم، ہمارے نامعلوم سے بہت چھوٹا ہے، معلوم اور نامعلوم میں وہی تناسب ہے جو درخت اور بیج میں ہوتا ہے، نامعلوم سے معلوم پیدا ہوتا ہے اور نامعلوم سے معلوم۔

میں ابھی تک اس دروازے کے اندر ہوں، آپ باہر ہیں، میں آپ کے لیے نامعلوم ہوں آپ میرے لیے نامعلوم ہیں، مگر کسی ایک ڈوری میں بندھے ہوئے ضرور ہیں، اس ڈوری کے کئی سرے ہیں، ایک میرے ہاتھ میں ہے، ایک آپ کے پاس ہے مگر ڈوری کا ایک سرا دوسرے سرے کو نہیں جان سکتا، مگر یہ آگہی اسے ضرور ہوتی ہے کہ کوئی دوسرا سرا موجود ہے، اور شاید یہ آگہی ہی وہ دروازہ ہے جس کے اندر میں داخل ہوا ہوں آپ چاہیں تو آپ بھی اس دروزاے کے اندر آسکتے ہیں مگر کب، کیسے......اس سوال کا کوئی ایک جواب ممکن نہیں ہے، ممکن ہے آپ کا اگلا قدم آپ کو اس دروازے تک لے آئے مگر اس میں داخل ہونے سے پہلے یہ سوچ لیجیے گا کہ آپ سب کچھ جاننا بھی چاہتے ہیں یا نہیں!

☆☆☆☆

خیرالدین انصاری

بزرگی

بزرگی چراغِ زندگی کی آخری لَو ہے، اس کے بعد روشنی کی حد ختم ہو جاتی ہے اور آگے اندھیرا ہی اندھیرا نظر آتا ہے۔

انسان کا بچپن ایک مست خرام ندی کی طرح شوخ وشنگ اور عہد شباب کوہسار کی بلندی سے گرنے والے آبشاروں کی طرح پُر شور اور تند خو! لیکن بزرگی کے کھلے پاٹ تک پہنچتے ہی اس کا سارا دم خم جاتا رہتا ہے۔ بڑھاپے کی مثال موسم سرما میں اُترتے ہوئے دریا کی سی ہے جسے ریت کے بستر پر لیٹ کر دھوپ تاپنے کے سوا کوئی کام نہیں ہوتا۔ ان دنوں اس کا وجود ہوتا بھی ہے اور نہیں بھی۔

بزرگ ہر ملک اور ہر قوم میں وافر تعداد اور مقدار میں پائے جاتے ہیں فیملی پلاننگ والے ان کا کچھ نہیں بگاڑ سکتے اور نہ ہی محکمہ صحت والے اس دنیا میں تادیر جیتے رہنے سے باز رکھ سکتے ہیں۔ اہلِ مغرب تو اپنے بزرگوں کو اولڈ ایج ہومز میں حیات جاوید گزارنے کے لیے چھوڑ آتے ہیں لیکن مشرق میں خاندانی شرافت اور قبائلی رسم ورواج آڑے آتے ہیں جن کی وجہ سے ہم اپنے بزرگوں کو اپنی حیات کا آخری تار منقطع ہونے تک اپنی چھاتیوں پر مونگ دلتے رہنے کی کھلی اجازت دیے رکھتے ہیں۔ گو ہماری دلی خواہش یہ ہوتی ہے کہ ہمارے بزرگ جلد از جلد جنت الفردوس میں تشریف لے جا کر شرابِ طہور سے شغل فرمائیں، مگر وہ نجانے کس مٹی کے بنے ہیں کہ زندگی کے موٹروے پر چٹان بن کر کھڑے ہو جاتے ہیں اور اپنے پیچھے آنے والی ٹریفک کو جام کر دیتے ہیں۔

بزرگی صوری اور صوتی لحاظ سے طبقہ نسواں سے تعلق رکھتی ہے لیکن اس کے سینے میں صنفِ نازک والا جذبۂ ترحم ہر گز نہیں ہوتا۔ اس کے رویّوں کو دیکھ کر تو یہ خیال اکثر آتا ہے کہ یہ کوا کب کی طرح ہیں کچھ اور نظر کچھ آتے ہیں۔ بزرگی کے رویوں کو جانچیے تو اندازہ ہوتا ہے کہ اس کا تعلق صنفِ کرخت سے ہے کہ اس میں دل کو دکھانے والی بہت سی صفات موجود ہیں لیکن سبھی اہلِ دانش اور اہلِ زبان اسے مؤنث ہی باندھتے چلے آئے ہیں دراصل یہ سارا کیا دھرا اس کے آخر میں آنے والی چھوٹی ''ی'' کا ہے

جس کو اگر کسی شعری ضرورت کے لیے گرا دیا جائے تو اس سے بہتوں کا بھلا ہو سکتا ہے۔

عورتیں اس لفظ سے بہت خار کھاتی ہیں۔ وہ اس بلائے بے درماں کو اپنے نازک وجود سے بہت دور رکھنے کی حتی الامکان کوشش کرتی ہیں اپنے بالوں کو رنگنا اور رخساروں پر سرخی اور پاؤڈر کی تہیں جمانا اسی کوشش کا ایک حصہ ہے۔ ایسا کر کے وہ سمجھتی ہیں کہ شاید وہ حقیقت پر پردا ڈالنے میں کامیاب ہو گئی ہیں اور ان کے شباب کا آفتاب ڈھلنے سے ٹل گیا ہے لیکن یہ ان کی سراسر خام خیالی ہوتی ہے۔ لوگ ان کی بزرگی کو اس کے اندازِ قد سے پہچان لیتے ہیں۔ کوئی بڑی بی، بے بی بننے میں کامیاب نہیں ہو سکتی۔

ویسے تو مردوں میں بھی اس سے کوئی اچھا سلوک نہیں کیا جاتا۔ وہ بھی اس پر ناک بھوں چڑھانا اپنا پیدائشی حق خیال کرتے ہیں تاہم ان میں ایک اچھا گروہ ایسا ضرور مل جاتا ہے جو اس کو اپنے اعصاب پر سوار کر کے خوش ہوتا ہے۔ حالاں کہ اس کے لیے تو صرف وہ ہستی موزوں ہے جس کے نقشِ پا کی شوخیاں اُن کہی داستانیں سناتی رہتی ہیں۔

میں اکثر تنہائی کے لمحوں میں سوچتا ہوں کہ لوگ بزرگی سے اتنا کیوں بدکتے ہیں جب کہ اس کے وجود میں خطرہ کم اور عافیت زیادہ ہے۔ ہر انسان موت سے ڈرتا ہے حالاں کہ اس کا ایک دن معیّن ہے۔ اس کے باوجود بعضوں کو اس کے آنے کے خیال سے رات بھر نیند نہیں آتی لیکن انسان کی بزرگی ایک عرصۂ دراز تک موت سے آنکھ مچولی کھیلتی رہتی ہے۔ موت بزرگی کو عقب سے دبوچنا چاہتی ہے مگر یہ ذاتِ شریف اس کے ہاتھوں سے باآسانی یوں نکل جاتی ہے جیسے مچھلی کسی اناڑی مچھیرے کے ہاتھوں سے! لوگ جب بزرگی کو ماہی بے تاب کی طرح تڑپتے دیکھتے ہیں تو خدا معلوم کس جذبے کے تحت وہ موت کے فرشتے کے کام کو آسان بنانے کے لیے مذہبی کتابوں کی تلاوت شروع کر دیتے ہیں اور پھر جب فرشتۂ اجل اپنا کام کر چکتا ہے تو زار و قطار آنسو بہانے لگتے ہیں جیسے انھوں نے بزرگی کو اپنے انجام تک پہنچانے میں تاخیر کر دی ہو۔

میں ایک حقیقت پسند انسان ہوں اس لیے بزرگی کے بارے میں مثبت رویہ رکھتا ہوں۔ میں دن رات بزرگی کو اپنے فن پر اوڑھے رکھتا ہوں، شاید میری اس روش کو دیکھ کر چند منچلوں نے مجھے اس وقت ہی بابا کہنا شروع کر دیا تھا جب میں نے ابھی لڑکپن کی سرحد تک کو عبور نہیں کیا تھا۔ پھر نجانے کیا ہوا کہ وہ لوگ خود ہی شرمندہ ہو کر بابا کی چوٹی سے پھسل کر چاچا کے ٹیلے پر آن رکے۔ پھر یہاں بھی طبیعت گھبرائی تو اُترائی میں اتر کر مجھے بڑا بھائی کہنے لگے جس سے مجھے فائدہ اور اُن کو نقصان پہنچا۔

میں بزرگی کو اپنا ہمدرد خیال کرتا ہوں اس لیے کہ میں اپنی موت سے نہیں ڈرتا۔ مجھے کامل یقین ہے کہ میری بزرگی میری موت کو کسی ایسی دوشیزہ کی صورت میں لے کر آئے گی جس کے رخسار سورج کی پہلی کرن کی طرح تابندہ، بانہیں شاخِ گل کی طرح لچکیلی اور بدن مسکراتے ہوئے پھول کی طرح تازہ اور ریشم کے لچھوں کی طرح نرم و ملائم ہوگا۔ اِسے دیکھ کر میرے لبوں پر تبسم کی لکیر پھیل جائے گی جسے لوگ موت کی نشانی سمجھ کر اطمینان کا سانس لیں گے۔

بزرگی کا ایک خاص فائدہ یہ بھی ہے کہ اس کے لیے معاشرے میں ایک خواہ مخواہ کا استحقاق پیدا ہو جاتا ہے۔ بزرگ آدمی کو لوگوں پر ناک بھوں چڑھانے اُن پر تنقید کرنے، اِن کے سامنے اپنی زندگی کے تجربات بیان کرنے اور ان کو نصیحتیں کرنے کا کھلا لائسنس مل جاتا ہے، بلکہ اسے ایامِ جوانی کے بارے میں ڈینگیں مارنے اور اپنے ماضی کے بارے میں جھوٹ موٹ کے طومار باندھنے کی کھلی چھٹی مل جاتی ہے۔ ایسا کرتے وقت اگر بزرگ آدمی کے ہاتھ میں عصا ہے (جو ہونا بھی چاہیے) تو کوئی اِسے ٹوکنے اور بیان کی گئی باتوں کا ثبوت مانگنے کی جرأت نہیں کر سکتا۔ خورد، اپنے بزرگ کی گپ کو شیرِ مادر سمجھ کر پی جانے پر مجبور ہوتے ہیں۔ بزرگ آدمی اگر کسی ایسی موٹر یا گاڑی میں سوار ہو جاتا ہے جس میں تل دھرنے کو بھی جگہ نہیں ہے تو بزرگ کو اس کا غم کھانے کی ضرورت نہیں ہے۔ اِسے تو اپنی آنکھوں میں خاص قسم کی چمک لا کر اِدھر اُدھر دیکھنا ہوگا جس کے فوراً بعد کوئی خورد اس کے لیے اپنی سیٹ خالی کر دے گا۔ اس طریقے سے اس کی بزرگی اس کے لیے وہ کام کر دے گی جو لاکھ منطق بگھارنے سے بھی نہ ہو سکے گا۔

جوانی میں جذبات کی آگ آدمی کے اندر ہوتی ہے جو موقع پاتے ہی باہر نکل آتی ہے لیکن بزرگی کے ایام میں آگ بالوں کی سفیدی بن کر سروں پر آن بسیرا کرتی ہے۔ اندر صرف بُرودت رہ جاتی ہے جو آدمی کو شاہراہِ حیات پر پھونک پھونک کر قدم رکھنے کا مشورہ دیتی رہتی ہے۔ اس صورت میں آدمی اگر کبھی اس صورت حال سے دوچار ہوتا ہے جو اس کی طبع کے خلاف ہوتی ہے تو بھی اپنا ردِعمل ظاہر کرنے سے پہلے سو بار سوچتا ہے اور بسا اوقات سوچتا ہی رہ جاتا ہے اور یوں اِس کے عیب و ہنر چھپے رہتے ہیں۔

بزرگی کا ایک خوش گوار پہلو بھی ہے وہ یہ کہ اگر کبھی عقل کا پاسبان آدمی کے دل کو تنہا چھوڑ دے اور اس کے منہ سے غلط بات نکل جائے تو بزرگی فوری طور پر اس کی امداد کو آ جاتی ہے۔ لوگ بزرگ

آدمی کو گریس مارکس دے کر اُس کی غلطی سے درگزر کرتے ہیں۔ اس بارے میں میرا ایک ذاتی تجربہ بھی ہے، میں ابھی پورا بزرگ نہ بنا تھا کہ دفتر کو جاتے ہوئے میری سائیکل ایک نوجوان کی سائیکل سے معانقہ کر بیٹھی۔ قصور کس کا تھا یہ تو میں نے نہیں سوچا کیوں کہ ابھی تک میری رگوں میں جوانی کا خون جوش مار رہا تھا۔ میں نے ایک زبردست طمانچہ اُس نوجوان کے منہ پر جڑ دیا جس سے اُن کا منہ لال ہو گیا۔ اُس کی نگاہیں بھی شرربار ہوئیں لیکن پھر اس کا دھیان میرے سفید بالوں کی طرف گیا تو اُسکی طبع کا سارا تناؤ جاتا رہا۔ اُس نے اپنے جذبات کو اعتدال پر لاتے ہوئے مجھ سے صرف اتنا کہا: ''بزرگو! اتنا غصہ نہیں کیا کرتے۔'' میں اُس کے اِس جواب پر بہت شرمندہ ہوا۔ جس سے میری حالت بدرد کے اس پانی کی طرح ہوگئی جوزدِ جاروب کھا تا جارہا ہو۔

اکثر نوجوانوں بزرگوں کو پسند نہیں کرتے، وہ انھیں اگلے وقتوں کے لوگ کہہ کر خوش ہوتے ہیں۔ شاید اس طرح وہ سمجھتے ہیں کہ ان کی یہ سوچ زمانے کی رفتار کو ٹھہراؤ دینے میں کامیاب رہے گی۔ وہ سدا جوانی کے مزے لوٹتے رہیں گے۔ اس لیے وہ یہ بھول جاتے ہیں کہ ان کے یہ بزرگ جن کی باتیں انھیں نہ پسند ہیں۔ یہ کبھی خود بھی انھیں کی طرح اپنے بزرگوں کے بارے میں سوچا کرتے تھے۔ پھر یہ دن آ گیا اور بزرگی نے آن کر ان کے ہاتھ میں چھڑی اور کاندھوں پر فرغل دے دیا تاکہ وہ دور سے پہچانے جا سکیں۔

وہ دن کتنا عجیب اور حسرت آمیز ہوگا جس دن یہ نوجوان اپنے ان بزرگوں کی جگہ پر آن کھڑے ہوں گے اور ان کے بعد آنے والی نسل ان سے ایسا ہی سلوک کرے گی۔

بزرگی آدمی کو تیز رفتاری کی صلاحیت سے محروم کر دیتی ہے۔ اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ وہ تیز تیز قدم اُٹھانے کے قابل نہیں رہتا بلکہ زندگی بھر کا تجربہ اِسے اس بات کا قائل کر لیتا ہے کہ دریا کی موجوں سے کھیلنے کی نسبت دریا کے کنارے پر کھڑے رہنے میں سلامتی ہے۔ آدمیوں کے ہجوم میں کھو کر رہ جانے سے کہیں زیادہ بہتر ہے کہ انسان ایک طرف کھڑے ہو کر اپنی عزتِ سادات کی نگہبانی کرتا رہے۔

بزرگی انسان کے ذہن میں یہ بات اچھی طرح بٹھا دیتی ہے کہ تیز رفتاری سے حادثات پھوٹتے ہیں دوسری طرف سُست روی میں اس کے مواقع بہت کم آتے ہیں۔ سُست رفتاری کے دوران میں میں اشرف المخلوقات تو کیا حقیر سے حقیر ذی روح بھی پامال ہونے سے بچ جاتا ہے۔ ٹھہر ٹھہر کر چلنے کا ایک فائدہ یہ بھی ہے کہ انسان کے سامنے جتنے بھی مناظر آتے ہیں وہ ان کی جزئیات تک کو

اپنے ذہن میں بٹھا لیتا ہے۔ سفر کرتے ہوئے اس کی جن جن اشیا سے ملاقات ہوتی ہے یہ اُن سب کا گہری نظر سے جائزہ لے کر انھیں اپنے نہاں خانۂ دل میں بٹھا لیتا ہے۔ اس طرح انسان ہر قدم پر نئے تجربات سے گزرتا ہے۔ یہ سب کچھ بزرگی کا عطیہ ہے ورنہ جوانی میں تو انسان بڑا بے صبرا ہوتا ہے۔ وہ نک دیکھ لیا، دلشاد کیا اور چل نکلے کہ عمل سے آگے جا نہیں سکتا۔

بزرگی کی خوبی یہ بھی ہے کہ بزرگ آدمی کے منہ سے ہمیشہ اچھی اچھی باتیں ہی نکلتی ہیں کیوں کہ بُری باتوں کا سارا اسٹاک یہ اپنے ایامِ جوانی میں ہی صرف کر چکے ہوتے ہیں۔ ان کے پاس اچھی باتوں کا جو اسٹاک ہوتا ہے اِسے بھی وہ سنبھل سنبھل کر استعمال کرتے ہیں کیوں کہ وہ جانتے ہیں کہ جس دن ان کے پاس یہ اسٹاک بھی ختم ہو گیا تو وہ ہمیشہ کے لیے چُپ ہو جائیں گے۔ اس کے بعد ان کے پسماندگان انھیں اپنے اپنے دیس کے احکامات و رسومات کے مطابق اگلے جہاں بھیج کر خود اپنے اپنے گھروں میں بیٹھ کر پلاؤ کھانے میں مصروف ہو جائیں گے۔

اب کہ مجھے بزرگی کی اچھائیوں کا پتا چل گیا ہے تو میں اکثر سوچتا ہوں کہ میں نے بزرگ بننے میں اتنی دیر کیوں کی۔ کیا یہ زیادہ بہتر نہ تھا کہ میں پیدا ہوتے ہی بزرگ بن جاتا۔ پھر میں نہ کسی مکتب میں جاتا اور نہ کسی کارخانے یا کھیت میں جا کر مزدوری کرتا۔ بس جس طرح بے داغ اس دنیا میں آیا تھا اسی طرح بے داغ واپس چلا جاتا مگر پھر میں سوچتا ہوں کہ اگر بے داغ آ کر بے داغ ہی لوٹ جانا تھا تو آنے کے تکلّف کی ضرورت ہی کیا تھی۔

☆☆☆☆

ڈاکٹر حسرت کاسگنجوی

خوشامد

خوشامد ایک بے حد مشکل آرٹ ہے۔ اس کے بارے میں مستند دستاویزات تو نہیں ملتیں لیکن سوچ بچار کرنے والے اس کی جو توضیحات کرتے ہیں وہ بہت دلچسپ اور کارآمد ہیں، مثلاً اس کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ جب یہ اپنے عروج پر ہوتی ہے تو جی چاہتا ہے کوئی ہماری خوشامد کرے اور اگر ایسا ممکن نہیں ہے تو ہم کسی کی خوشامد کریں۔ کتنے بدنصیب ہیں وہ لوگ جو خوشامد کے لفظ سے ہی الرجک ہیں۔ ممکن ہے عام لوگوں نے عام انداز میں خوشامد کی جو تاویلیں اور تعریفیں کی ہیں وہ کچھ زیادہ ہی منفی نوعیت کی ہوں۔ لوگوں کا زبردستی اسے کمزوری کے کھاتے میں ڈال دینا کہاں کا انصاف ہے۔ میرا خیال ہے کہ خوشامد کرتے وقت بڑے حوصلے اور فراخ دلی کی ضرورت ہوتی ہے۔ قوتِ برداشت کا دامن ہاتھ سے نہ جانے دیا جائے، نئے اور انوکھے انداز سے خوشامد کو اپنی پوری تفصیل کے ساتھ سامنے آنے کا موقع دیا جائے۔ یہ دوسری بات ہے کہ بعض لوگوں کے دل میں باریک باریک سی چیزیں کھٹکتی ہیں، تکلیف دیتی ہیں۔ وہ کچھ عجیب سی کیفیت محسوس کرتے ہیں جسے ہم جذباتیت بھی تو نہیں کہہ سکتے۔ سنجیدہ خوشامدیوں کو اس جذبے پر مکمل کنٹرول کی ضرورت پیش آتی ہے لیکن کبھی کبھی یہ بھی ہوتا ہے کہ ہماری فطرت اور طبیعت میں پہلے ہی سے خوشامد کے جذبے موجود ہوتے ہیں جو ہمیں بے اختیار خوشامد کرنے کے لیے اکساتے اور مجبور کرتے ہیں۔ کسی اور بات کا اندازہ اگر ہوتا بھی ہے تو اس وقت جب خوشامد سے ہونے والا کام ختم ہو چکا ہوتا ہے۔

خوشامدی کے بارے میں یہ غلط بات بہت مشہور ہے کہ وہ ایک بزدل، کمزور، بے حس، خوف زدہ اور مجبور انسان ہے جسے انسانی جذبوں پر قابو پانے کی توفیق عطا نہیں ہوئی، مگر میں کہتا ہوں کہ یہ ایک فطری بات ہے کہ کمزور آدمی اپنی کمزوری کو ہر ممکن طریقے سے چھپانے کی پوری کوشش کرتا ہے۔ خوشامد کرتے وقت وہ اپنی تمام صلاحیتیں اس بات پر صَرف کر دیتا ہے کہ وہ باور کرا دے کہ وہ خوشامد نہیں کر رہا ہے بلکہ جس کی وہ خوشامد کر رہا ہے اس کے ہی بھلے کی بات کر رہا ہے۔ فلسفی اس کی توضیح کرتے

ہوئے برملا کہتے ہیں کہ جب شیر میدان میں آتا ہے تو دوسرے تمام جنگل کے جانور اپنی حقیقت سے واقف ہونے کی وجہ سے ڈرے ڈرے سے رہتے ہیں اور کوشش کرتے ہیں شیر کا موڈ خراب نہ ہونے پائے اس لیے کبھی وہ اسے جنگل کا بادشاہ کہتے ہیں کبھی اس کی مونچھوں کی تعریف کرتے ہیں کبھی اس کی بے تحاشا طاقت کا اقرار کرتے ہیں۔ کوئی اس کی خوراک لاتا ہے کوئی اس کی دھاڑ کو دھاکے سے تعبیر کرتا ہے۔ یہ ساری باتیں محض اس لیے ہوتی ہیں کہ وہ جسمانی طور پر کمزور ہوتے ہیں انھیں جان کی امان خوشامد میں ہی نظر آتی ہے۔

غور کیجیے کہ جب خوشامدی خوشامد کرتا ہے تو اس کی سب سے پہلی جنگ اپنی انا اور ضمیر سے ہوتی ہے اس کی انا نہیں چاہتی کہ وہ شخصیت کو مجروح کر کے وہ کام کرے جو اس کے معیار اور ضمیر کی آواز کے خلاف ہو لیکن مجبوریوں کے اس تسلسل میں راہ فرار اختیار کرنا ضروری ہو جاتا ہے۔ خوشامدی اپنے ہی ہاتھوں سے اپنی شخصیت کے گلے پر تیز قسم کی چھری اس طرح پھیرتا ہے کہ زندگی سے جدا ہونے والی آخری آواز بھی نہیں سُن پاتا اور شخصیت خون میں لت پت ہو جاتی ہے۔

خوشامدی پر بُرے سے بُرا وقت آ سکتا ہے، آتا ہے لیکن وہ اسے اپنی خوشامد کا نتیجہ قرار نہیں دیتا بلکہ یہ خیال ذہن میں لاتا ہے کہ میری کسی اور بات سے یہ سانحہ پیش آیا ہے کیوں کہ خوشامد تو دہکتی ہوئی آگ پر پانی کی حیثیت رکھتی ہے۔ وہ حالات کو شدید نہیں ہونے دیتی کم ہی کرتی ہے اس لیے اس سانحہ میں خوشامد کا عمل دخل کیسے ہو سکتا ہے۔ خوشامدی اپنی فطرت کے مطابق کم و بیش بھی ہو سکتا ہے۔ جب وہ یہ دیکھتا ہے کہ طاقت کا پلہ دوسری طرف پلٹ گیا ہے تو وہ موقع محل کی نزاکت کو دیکھ کر اپنی خوشامد کے رُخ کا بھی تعین کر لیتا ہے۔ کمزور اور بے بس اذہان سے اور توقع بھی کیا کی جا سکتی ہے دنیاداری بھی تو یہی ہے۔ سلام تو طاقت ور انسان کو ہی کیا جاتا ہے۔

خوشامدی ممکن ہے دیکھنے میں سیدھا سادا، بھولا بھالا اور مسکین نظر آئے لیکن وہ ایسا ہوتا نہیں، نفسیات کی باریکیوں کو وہ خوب سمجھتا ہے۔ بڑی آسانی سے وہ ہر چہرے کو پڑھ لیتا ہے۔ موقع محل کا اندازہ لگا لینا اس کے لیے کوئی مشکل کام نہیں جیسے جیب تراش چلتے ہوئے آدمی کی جیب میں رکھے ہوئے تازہ کرارے نوٹوں کی تعداد محض سونگھ کر بتا سکتا ہے اسی طرح خوشامدی شخص اپنے فن میں اتنا ماہر ہوتا ہے کہ وہ یہ بتا سکتا ہے کہ اس کی خوشامد کا جادو کس شخص پر اور کس حد تک چل سکتا ہے۔ وہ بتدریج اپنی مہارت کا جادو جگاتا ہے۔ اس کے لیے وہ کوئی ریہرسل وغیرہ نہیں کرتا بلکہ ہوتا یہ ہے کہ خوشامدی کے

الفاظ خود بخود ترشے ترشائے ڈھلے ڈھلائے روانی کے ساتھ نازل ہونے لگتے ہیں اور موقع محل کے مطابق سین مکمل ہوتا چلا جاتا ہے اور خوشامدی کے مدمقابل کے ذہن پر ٹھیک ٹھیک نشانے لگتے ہیں اور اس طرح خوشامدی کو اپنی ریاضت کا پورا فائدہ پہنچتا ہے۔

خوشامدی اگر فلسفی نہیں بھی ہے تو کوئی حرج کی بات نہیں۔ فلسفی ہونا ایسی کوئی بڑی معرکے کی بات بھی نہیں ہے۔ فلسفے کی تھیوری اور عمل میں ہمیشہ سے خاصہ فاصلہ رہا ہے۔ جو لوگ فلسفے کی تھیوری پر تکیہ کرتے ہیں وہ فلسفیوں کے نام لیتے نہیں تھکتے جب کہ خوشامدی چہرے کے اُتار چڑھاؤ کے حوالے سے اپنے فلسفے کو خود ترتیب دیتا ہے۔ کتابی فلسفے پر وہ نہ تو بھروسا کرتا ہے اور نہ اسے مُعتبر ہی گردانتا ہے۔

خوشامدی موقع محل دیکھ کر اپنی گفتگو کی ابتدا کرتا ہے۔ وہ خوب جانتا ہے کہ کہاں کہاں اور کن کن باتوں پر زور دینے کی ضرورت ہے۔ انسان کی فطری اور بنیادی کمزوریاں کیا ہیں۔ وہ کہاں پگھل سکتا ہے۔ کہاں موم ہوسکتا ہے اور کون سی بات اس کے مزاج کے خلاف ہوسکتی ہے۔

خوشامد کرنے والا کمزور نہیں ہوتا۔ کمزور تو وہ لوگ ہیں جو خوشامد پسند ہیں۔ اس بات کو اس طرح بھی کہا گیا ہے کہ خوشامدی خوشامد کر کے دوسروں کو بے وقوف بناتا ہے۔ جس کی وہ خوشامد کرتا ہے اس میں وہ خوبی ہوتی ہی نہیں جس کی وہ نشاندہی کرتا ہے۔ بلکہ جسے وہ کئی گنا ضرب دے کر بڑھاوا بھی دیتا ہے۔

خوشامد سننے والا شخص غلط فہمی میں پھولتا چلا جاتا ہے۔ خوشامد اس شخص کے احساس کمتری کو کم کرنے میں ایک اہم کردار ادا کرتی ہے۔

خوشامدی ماہر نفسیات سے بھی بازی لے جاتا ہے۔ وہ حرفوں کا بنا ہوا ہوتا ہے۔ وہ باقاعدگی کے ساتھ اپنے مدمقابل کو جس طرح چاہتا ہے گھماتا ہے، اسے وہ اس کے آئیڈیلز کی تصویریں دکھاتا ہے۔ لچھے دار باتیں کر کے وہ اس کے جی کو گرماتا ہے۔ ان باتوں کا ذکر تفصیل سے کرتا ہے جسے وہ پسند کرتا ہے اور پھر وہ اُسے یقین کی اُس حد پر لے آتا ہے جس کے بعد کوئی راستہ ہی نہیں رہتا۔ خوشامدی دوسروں کو مفروضوں کی دنیا میں لپیٹنا خوب جانتا ہے۔ وہ جس کی خوشامد کرتا ہے اِسے خوش فہمی میں مبتلا کر دیتا ہے۔ سبز باغ دکھانے میں مہارت رکھتا ہے۔ وہ خوابوں میں رنگ بھرنے کا ماہر ہے......وہ ناممکن العمل باتوں کو اس طرح سجا کر رنگ اور روشنی میں ڈبو کر پیش کرتا ہے کہ خوشامد سننے والا خواہ کتنا ہی شاطر کیوں نہ ہو دھوکا کھا جاتا ہے۔

خوشامدی موضوع کے تبدیل کرنے میں بھی ماہر ہوتا ہے۔ جب دیکھتا ہے کہ اس کی جد و جہد کا کوئی پہلو کسی وجہ سے کمزور پڑ رہا ہے تو وہ نہایت دانشمندی کے ساتھ پہلو بدل کر بات کرتا ہے۔ نہایت عرق ریزی سے وہ کمزوری تلاش کرتا ہے جسے خوشامد سننے والا ظاہر نہیں ہونے دیتا۔ یوں دونوں ایک انجانی سی کیفیت میں مبتلا رہ کر اپنا اپنا جادو جگاتے ہیں۔ خوشامد کیوں کہ انسان کی فطری کمزوری ہے۔ وہ باوجود کوشش کے اس پر قابو نہیں پا سکتا۔ تھوڑی دیر کی کشمکش کے بعد خوشامدی عام طور سے سُرخ رُو ہو جاتا ہے۔ وہ اپنے مدمقابل کو پچھاڑ دیتا ہے' یہ وہ وقت ہوتا ہے جب خوشامدی اپنے عروج پر ہوتا ہے۔

خوشامد کی سیدھی سادی شکلوں کو تو سب جانتے ہیں، ان کے نتائج کا بھی سب کو یقین ہوتا ہے مگر ایک جدّی پُشتی خوشامدی وہ طریقہ آزماتا ہے جس کے بارے میں عام لوگوں کو زیادہ علم نہیں ہوتا۔ وہ خوشامد قبول کرنے والے کو خبر تک نہیں ہونے دیتا کہ وہ خوشامد کا شکار ہو رہا ہے۔ بعض خوشامدی اپنے فن میں اتنے زیادہ ماہر ہوتے ہیں کہ وہ زیادہ جد و جہد بھی نہیں کرتے اور خوشامد کے فن کی شاہکار مثالیں قائم ہو جاتی ہیں۔

ویسے خوشامد اتنی بُری چیز بھی نہیں ہے جتنی اس کی تشہیر کی گئی ہے۔ خوشامد ایک طرح سے انسان کو کسی جانب راغب کرنے کا بھی تو نام ہے، خوشامد ایک حربہ ہے جو ایسے لوگوں کے لیے کارآمد ہو سکتا ہے جو اپنی صلاحیتوں سے واقف نہیں ہوتے۔ خوشامد انھیں بڑے بڑے کاموں کے لیے آمادہ کر سکتی ہے۔ خوشامد ایک خوشگوار ماحول پیدا کرنے کا عمل بھی ہے۔ بس جذبے اور احساس کی بات ہے۔ بعض باتیں آتی تو خوشامد کے ذیل میں ہیں لیکن ان سے ہمت افزائی بھی ہوتی ہے اور بے ہمتی میں تخفیف بھی ہو جاتی ہے۔

خوشامد ایک ایسا ہتھیار ہے جو کسی اناڑی کے ہاتھ میں ہو تو وہ مُنہ کی کھاتا ہے مگر ایک فن کار کے ہاتھ میں ہو تو ذیل کار نیگی بن کر شہرتِ عام اور بقائے دوام حاصل کر لیتا ہے۔

☆☆☆☆

اکبر حمیدی
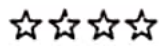
میں کہاں ہوں

کل صبح جب میں سو کر اُٹھا تو خلافِ معمول بہت سنجیدہ تھا۔

دراصل رات کو سونے سے پہلے ایک عجیب سا خیال میرے دماغ میں گھس آیا تھا جس کا میں کوئی جواب فوری طور پر نہ دے سکا تھا۔ ویسے تو یہ ایک خیال ہی تھا مگر اس میں ایک سوال بھی موجود تھا اور اس سوال نے مجھے کچھ گڑبڑا دیا تھا۔ سوچا صبح اُٹھوں گا تو اطمینان سے اس کے بارے میں سوچ لوں گا۔ پھر مجھے برٹرینڈ رسل کی یہ نصیحت بھی یاد آ گئی تھی کہ ''رات کو تو بالکل سوچنا نہیں چاہیے۔'' ایک ہلکا سا گمان یہ بھی تھا کہ ممکن ہے صبح تک یہ عجیب سا خیال کہیں نقل مکانی کر جائے اور میں اپنی ہشاش بشاش زندگی بسر کرتا رہوں۔ عجیب خیالوں سے بعض اوقات اور سنجیدہ لوگوں سے اکثر' جہاں تک ممکن ہوتا ہے میں بچ نکلنے کی کوشش کرتا ہوں۔ عجیب خیالوں تک تو بات قابلِ برداشت ہے کہ بعض اوقات عجیب خیالات سنجیدہ نہیں بھی ہوتے اور ان کا عجب پن کسی قدر پُر لطف بھی ہوتا ہے۔ پھر میرا تجربہ یہ بھی ہے کہ عجیب خیالوں کو اگر تھوڑا ا(Twist) دے کر دیکھا جائے تو اکثر وہ پُر لطف ہو جاتے ہیں۔ ٹوسٹ دینے سے میری مراد ہے زاویے بدل بدل کر انھیں دیکھا جائے تو ان کے کئی ایک ایسے مناظر بھی سامنے آتے ہیں جو خاصے دل خوش کن ہوتے ہیں اور سنجیدگی کی بور کیفیت سے انسان کی حفاظت کرتے ہیں۔

یہاں مثلاً ایک معمولی سی بات عرض کرتا ہوں جو میری ذاتی تجربے میں آتی رہتی ہے کہ جب کبھی کوئی بور سا عجیب خیال جو سنجیدگی میں ملوث ہو، مجھے ستانے لگتا ہے تو میں احتیاطاً آئینہ دیکھ لیتا ہوں اور اس میں اپنے چہرے کو گھما پھرا کر کئی زاویوں سے مشاہدہ کرتا ہوں اور تسلی کرنا چاہتا ہوں کہ میں وہی ہوں کہ نہیں ہوں جو کچھ دیر پہلے اچھا خاصا خوش و خرم چل پھر رہا تھا اور ہر طرح خیر و عافیت سے تھا اور اگر وہی ہوں تو پھر یہ سنجیدہ عجیب خیال کیسے مجھ پر حملہ آور ہو گیا! اکثر میں اپنے آپ کو اس حالت میں پاتا ہوں جو ایک نارمل سی حالت ہوتی ہے تب میں اطمینان کی سانس لیتا ہوں کہ خیر سے کوئی خطرے کی بات نہیں......ایسے ہی کہیں کھانے پینے میں کمی بیشی ہوگئی ہوگی۔

زندگی میں کئی مرتبہ آدمی کو کوئی ایسی صورتحال پیش آجاتی ہے کہ انسان پریشان ہو جاتا ہے۔ ایسے حالات میں بھی یہی نسخہ آزماتا ہوں یعنی آئینہ دیکھنے والا۔ مگر اس میں ذرا سا اضافہ اپنے آپ سے مکالمے کا بھی کر لیتا ہوں۔ مثلاً سخت پریشانی یا بے چینی میں اپنے آپ کو آئینے میں دیکھ کر مسکراتا ہوں اور پوچھ لیتا ہوں: ''سنا بچہ کیا حال ہے۔ بڑا پھنے خاں بنتا تھا' بس اتنے میں چیں بول گئی۔'' اکثر اُدھر سے جواب آتا ہے: ''نہیں نہیں پیارے میں ٹھیک ہوں۔ بس ذرا یوں ہی بے چین ہو گیا تھا۔ تم فکر نہ کرو سب ٹھیک ٹھاک ہے'' تب میں مسکراتا ہوں اور اپنا چہرہ بحفاظت آئینے سے باہر نکال لیتا ہوں۔ پھر اطمینان کی گہری سانس لیتا ہوں۔ حافظ ایسے میں اکثر یاد آتے ہیں۔ ''چناں نا ماند چنیں نیز ہم نخواہد ماند'' یعنی وہ حالت نہیں رہی ہے تو یہ بھی نہیں رہے گی۔

آغاز میں، مَیں نے ذکر کیا تھا کہ رات سونے سے پہلے ایک عجیب سا خیال میرے ذہن میں گھس آیا تھا۔ واقعہ یہ ہوا کہ میں ذرا سا پریشان تھا سو حسبِ معمول آئینے میں اپنے آپ سے مکالمہ کیا۔ خیال تھا کہ مجرب نسخہ ہے حسبِ سابق کامیاب ثابت ہوگا۔ مگر اب کہ شاید عمل میں کچھ کمی رہ گئی تھی، سو اس خیال کو اندر ہی اندر گھما پھرا کر مختلف زاویوں سے دیکھنے کے باوجود افاقہ نہ ہوا۔ بلکہ یہ عجیب سوال سنجیدگی اختیار کرتا چلا گیا اور اُلٹا مجھے اپنے سنجیدہ زاویے دکھانے لگا۔ ہوا یوں کہ جیسے ہی میں نے آئینے میں اپنے آپ سے مکالمے کا آغاز کیا، فوری طور پر یہ خیال میرے ذہن میں در آیا کہ یہ مکالمہ میں کس سے کر رہا ہوں؟ میں نے بھی ترکی بہ ترکی جواب دیا: ''اپنے آپ سے!'' لیکن اُدھر سے پھر سوال آیا: ''تم کہاں ہو؟'' اب ذرا سا مجھے سوچنا پڑا کہ جواب میں کیا کہوں: وہاں ہوں آئینے کے اندر یا یہاں ہوں آئینے کے باہر! بظاہر تو باہر ہی نظر آتا ہوں مگر کیا باہر بھی ہوں؟

بس اس پر مجھے پریشانی سی ہوئی تو سوچنا پڑا کہ ''میں کہاں ہوں.....؟ میں کہاں ہوں...... میں کہاں ہوں؟'' اور پھر جب ''میں میں'' کی اچھی خاصی آوازیں آنے لگیں تو مجھے ایسا لگا جیسے میں ممیانے لگ گیا ہوں۔ تب جیسے کوئی ٹھنڈے پانی کا گلاس پیتا ہے کہ ذرا سکون آئے میں نے برٹرینڈ رسل کو یاد کیا جس نے کہا تھا ''رات کو تو بالکل سوچنا نہیں چاہیے۔'' اس سے مجھے کچھ اطمینان سا ہوا اور میں نے جی ہی جی میں کہا کہ اس سوال کا جواب اسی وقت تلاش کرنا کچھ ایسا ضروری بھی نہیں ہے کیوں کہ اس سوال کا جواب تلاش کیے بغیر بھی یہ دنیا چلتی رہے گی۔

صبح بیدار ہوا تو یہ سوال خیال کی شکل میں پھر سے میرے دماغ میں گھس آیا کہ ''میں کہاں

ہوں؟''اس کا آسان جواب تو یہی تھا کہ''میں اپنے گھر پر ہوں اور کہاں ہوں۔''مگر پتا نہیں کیوں اس سے کچھ اطمینان حاصل نہ ہوا۔ شاید سوال کی نوعیت میرے لاشعور میں عمل پیرا تھی۔ تب یہ سوال مجھے اپنے زاویے دکھانے لگا جس طرح پہلے میں خیالوں کو ان کے زاویے بدل بدل کر دیکھتا تھا اور اس مشغلے میں اچھا خاصا لطف اندوز بھی ہوتا تھا۔ بالکل اسی طرح سے یہ عجیب خیال چہرے بدل بدل کر میرے سامنے آنے لگا۔ اب میں سوال کی نوعیت کو کچھ کچھ سمجھنے لگا تھا کہ اپنے جسم میں میں کہاں ہوں، کس جگہ واقع ہوں، کس حصے میں ہوں؟

سب سے پہلے دھیان' دماغ کی طرف گیا جو میرے حکم پر بعض اوقات میرے حکم کے بغیر بھی' بلکہ کئی مرتبہ منع کرنے پر بھی' کسی بات پر خود کار مشین کی طرح سوچنے لگتا ہے اور اکثر میرے بس میں نہیں رہتا! وہ کچھ بھی سوچ جاتا ہے جو میں نہیں چاہتا۔ تب پتا چلا کہ دماغ کوئی الگ سی چیز ہے۔ گویا ''میں دماغ نہیں ہوں۔'' دماغ اور میں دو مختلف ہستیاں ہیں' یا کم سے کم میرا قیام دماغ میں نہیں ہے، کہیں اور ہے' مگر کہاں؟

تو پھر میں کہاں ہوں؟ دماغ کے ساتھ ساتھ ہمارے ہاں دل کو بھی ایک خاص جذباتی اور بعض اوقات فیصلہ کن حیثیت دی جاتی ہے۔ اگرچہ میڈیکل والے اِسے محض خون کو گردش دینے والا ایک آلہ ہی کہتے ہیں مگر خصوصاً ادب میں اور روحانیت میں دماغ کے متوازی دل کی بھی ایک بڑی حیثیت ہے۔ تو پھر کیا میں دل میں ہوں۔ یا کیا میں دل ہوں؟۔۔۔ مگر دل کا تو مجھ سے اور میرا دل سے اکثر اختلافات رہتا ہے۔ اور اب تو میں بعض اوقات اس کے سامنے خاصا شرمسار رہتا ہوں۔ ایک زمانہ تھا جب آتش جوان تھا اور حضرتِ دل زوروں پر تھے، ہر وقت مشورے دیتے رہتے تھے کہ'' یہ کرلو' وہ کرلو، موقع ہے، پھر نہیں ملے گا!'' بعض اوقات یہ حضرتِ دماغ کو بھی ساتھ ملا لیتے ہیں۔ اپنے مزاج اور عادت کے خلاف اپنے حق میں بھرپور دلائل دیتے تھے۔ اس کے باوصف کہ یہ مشورے اکثر مجھے بہت لذیذ اور عزیز لگتے تھے اور میں یہ سمجھتا تھا کہ ان مشوروں پر عمل کرنے اور زندگی سے لطف اندوز ہونے کے یہی مواقع ہیں جو ایک بار ہاتھ سے نکل گئے تو پھر عمرِ عزیز میں دوبارہ نہیں آنے کے' میں نے ان مشوروں کو ہمیشہ ٹھکرا دیا تھا اور اب کے میں اس عمر کو پہنچا ہوں تو جذباتی سطح پر دل کو درست خیال کرنے لگا ہوں۔ بعض اوقات افسوس ہوتا ہے کہ میں نے دل کے مشوروں کو ٹھکرا کر اپنی زندگی کو کیوں بے کیف رکھا اور کیوں نہ زندگی کے اوراق کو رنگین کرلیا! اُس وقت مجھے اپنا رویہ بہت قابلِ فخر لگتا

تھا مگر سچی بات یہ ہے کہ اب وہی رویہ ایک تکلیف دہ حسرت کے سوا اور کچھ نہیں جس کے باعث میں حضرتِ دل کے سامنے اب مستقل طور پر شرمسار ہوں!! مگر خیر یہ باتیں تو برسبیلِ حکایت زبان پر آ گئیں۔ کہنا یہ تھا کہ دماغ کی طرح بھی مجھ سے مختلف کوئی چیز ہے! تو پھر کیا میں ضمیر ہوں؟

نہیں ہرگز نہیں۔ میں اس زاہدِ خشک سے اکثر اختلاف کرتا رہا ہوں۔ میں نے ہمیشہ انسانی سطح پر رہنے کی کوشش کی ہے' جب کہ یہ صاحب ہمیشہ مجھے ایک پاکیزہ بلکہ متبرک انسان دیکھنا چاہتے تھے' جو انسان تو ہو مگر فرشتہ بن کر زندگی گزارنے اور دھوبی سے دھلے ہوئے کپڑے کی طرح صاف شفاف دکھائی دے۔ میں ذاتی طور پر اپنے آپ کو ایک روشن خیال اور ایک حد تک آزاد خیال انسان بنائے رکھنے کے لیے کوشاں رہا ہوں۔ کوئی متبرک انسان بن کر رہنا بہت اچھا سہی مگر میرے بس کی بات نہیں۔

جبلت اس کے برعکس کوئی چیز ہے جو مجھے کھل کر کھیلنے کی آزادی دیتی ہے بلکہ ترغیب بھی۔ کئی دفعہ اس قوت نے مجھ پر غلبہ پانے کی سعی بھی کی ہے مگر میں نے واپس جنگل میں جانے سے ہمیشہ انکار کر دیا ہے۔ بھلا میں واپس کیوں جاؤں جب کہ راستہ مجھے جنگل سے باہر بلاتا ہے۔ میں صدیوں پر پھیلی، انسانی محنت و ریاضت کو اپنے قدموں سے برباد کرنے کا سوچ بھی نہیں سکتا۔ پہلے آدمی سے لے کر آج اکیسویں صدی کے آدمی تک انسان نے تہذیب و تمدن کا جو طویل اور دشوار گزار سفر طے کیا ہے، کیا میں اس عظیم سفر کو بے حقیقت کر دوں اور پھر سے واپس جنگل میں چلا جاؤں اور جانور بن جاؤں!.....ناممکن!

گو کوشش اور خواہش کے باوجود میں جبلت سے کلی طور پر نجات حاصل نہیں کر سکا' پھر بھی میں اس کے غلبے کو قبول نہیں کر سکتا اور اپنی زندگی اور اپنا مستقبل اس کے حوالے نہیں کر سکتا۔ سچی بات یہ ہے کہ میں کسی کا بھی اور کسی بھی قسم کا غلبہ قبول کرنے کے لیے تیار نہیں ہوں۔ میں خود غالب رہنا چاہتا ہوں۔ یہ جذبہ مجھے بنانے والے نے میرے اندر ڈال رکھا ہے۔ ڈارون صاحب نے جس جنگل کی نشاندہی کی تھی، بے شک ابھی اُس جنگل کا کچھ حصہ میرے اندر موجود ہے جہاں سے مجھے وحشی غراہٹوں کی آوازیں سنائی دیتی رہتی ہیں، کبھی کبھی میں اس جنگل کو اپنے آس پاس پھیلتا ہوا بھی محسوس کرتا ہوں مگر میں اس جنگل کو اپنی قیام گاہ نہیں بنانا چاہتا.....نہیں بنانا چاہتا.....کہ دنیا کے دلکش اور تہذیب یافتہ مناظر مجھے اپنی طرف بلاتے ہیں۔ تو پھر میری قیام گاہ کہاں ہے؟ اور میں کہاں ہوں؟

اپنے جسم پر نگاہ ڈالتا ہوں تو چھ فٹ ایک انچ کے اس رقبے میں مجھے کوئی ایک مقام بھی ایسا دکھائی نہیں دیتا جہاں میں ہونے کا دعویٰ کر سکوں یا جسے میں کہہ سکوں کہ میں ہوں!!

یہ سب چیزیں جن کا ذکر میں نے ابھی کیا ہے، میرے آس پاس کی چیزیں ہیں اور بے شک کسی نہ کسی طرح میری زندگی میں دخیل ہیں مگر ان میں سے کوئی ایک بھی ایسی نہیں جسے میں اپنی ذات کہہ سکوں یا جسے میں اپنا مقام قرار دے سکوں۔ یہ سب چیزیں میری زندگی کا لازمی حصہ ہیں مگر پھر بھی ایسی ہیں جو اختلافی ہیں یا جن سے میرے اختلافات بہت واضح نظر آتے ہیں۔ یہ سب مجھ میں ہونے کے باوجود مجھ سے الگ تھلگ ہیں اور اپنی اپنی زندگیاں بسر کر رہی ہیں اور اپنے اپنے مزاجوں کی مالک ہیں۔

جب میں آئینے میں اپنے آپ سے مکالمہ کر رہا ہوتا ہوں تو کیا میں آئینے کے اندر ہوتا ہوں یا آئینے کے باہر؟ آئینے کے اندر میرا ہی عکس ہوتا ہے' باہر والے شخص کی حقیقت کا حال کسی قدر میں نے عرض کر دیا ہے۔ تو پھر وہ کون ہے جو مکالمہ کر رہا ہوتا ہے' اور کس کی خیر خبر پوچھ رہا ہوتا ہے۔۔۔۔ مجھے نہیں معلوم!! مگر یوں لگتا ہے، تب میں وہیں کہیں آس پاس ہی موجود ہوتا ہوں۔۔۔۔ مجھے یقین ہے میں کسی روز ضرور اپنے آپ کو تلاش کر لوں گا۔ اگر ایسا ہو گیا تو یہ اکیسویں صدی کا سب سے انہونا واقعہ ہوگا۔۔۔!!!

عذرا اصغر

خوشی

خوشی چار حروف پر مشتمل ایک چھوٹا سا لفظ ہے، مگر بظاہر یہ چھوٹا سا لفظ اپنے اندر کثیر معنی رکھتا ہے۔ میں نے غور کیا تو مجھ پر منکشاف ہوا کہ خوشی تو ایک ایسا لامحدود معنوں والا لفظ ہے کہ لُغت بھی اس کا یک لفظی معنی بنانے سے قاصر ہے۔ روز مرّہ میں بولا جانے والا یہ چھوٹا سا لفظ عجیب وغریب جذبوں کی ترجمانی کرتا ہے، جب میں نے مزید غور کیا تو مجھ پر یہ راز کھلا کی خوشی تو اپنے تئیں ایک بے حد مظلوم لفظ بھی ہے جسے کوئی بے موقع بھی استعمال کرے تو حرفِ شکایت زبان پر نہیں لاتا۔ یہی نہیں بلکہ سننے والے کے اندر طمانیت کا احساس بھی پیدا کرتا ہے۔ گویا لفظِ خوشی ایک ایسا بیکراں ذخیرہ ہے جو کبھی ختم نہیں ہوتا۔

مثلاً آپ کے کسی ملنے والے کی ترقی ہوئی، ہم مرتبہ ہونے کے ناتے یہ ترقی آپ کو ملنا چاہیے تھی یا آپ چاہتے تھے کہ اس عہدے پر آپ کی ترقی ہوتی۔ اس کے لیے آپ نے کوشش بھی کی تھی، لیکن ترقی آپ کے ساتھی کو مل گئی آپ اپنے ساتھی پر یہ ظاہر ہونے دینا نہیں چاہتے تھے کہ اس ترقی کے آپ کس قدر خواہشمند تھے۔ لہٰذا آپ اپنے ساتھی کو مبارکباد پیش کرتے ہیں اور کہتے ہیں:

''یار بہت خوشی ہوئی'' پس یہ لفظ جو آپ کے اصل جذبات کی پردہ پوشی بھی کرتا ہے اور آپ کے اخلاقِ حسن کو بھی ظاہر کرتا ہے اپنے تئیں کتنا مظلوم لفظ ہے، پھر یہی لفظ جب اپنے دلی جذبات کی ترجمانی کے لیے آپ استعمال کرتے ہیں تو اس کا ایک ایک لفظ سننے والے پر آپ کی دلی کیفیت کو آشکار کرتا ہے اور آپ کی سرشاری میں اضافے کا باعث بنتا ہے اور یوں یہ لفظ اپنی نکتہ دانی اور خیر سگالی کے جذبات پیدا کرتا ہے۔ یہی نہیں بلکہ سُننے والے کے اوپر بھی خوشگوار اثر مرتب کرتا ہے۔ اس کے دل میں آپ کے لیے محبت، تشکر اور خیر سگالی کے جذبات پیدا کرتا ہے۔

میرے خیال میں خوشی کے حصول کے لیے کچھ زیادہ تگ ودَو کرنا نہیں پڑتی۔ خوشی نہ مول ملتی ہے اور نہ ادھار لی جا سکتی ہے، خوشی کا بُوٹا انسان کے اپنے اندر سے پھُوٹتا ہے۔ اس کی جڑیں انسان کے وجود میں پیوست ہیں اور اس کی مٹی کے خمیر سے نمو پاتی ہیں۔ خوشی کی نشو ونما کے لیے انسان کے ''اندر''

کا زرخیز ہونا ضروری ہے۔ اگر کسی انسان کا ''اندر'' شورزدہ ہے تو خوشی کے سوتے پھلنے پھولنے سے پہلے ہی مرجھائیں گے۔

بعض افراد مزاجاً ہر وقت خوش رہتے ہیں اور بعض دوسروں کو خوش دیکھ کر خوش ہوتے ہیں، کچھ تعداد ایسے افراد کی بھی ہے جو لفظ خوشی کو رسماً برتتے ہیں۔ ان کے نزدیک خوشی معمول کے استعمال کی چیز کے مانند لفظ ہے جو عام بول چال میں ہمہ وقت بولا جاسکتا ہے۔ خوشی کا لفظ تحلیلِ نفسی کا ایک موثر ذریعہ ہے۔ ایک مایوس اور غمزدہ شخص کے لیے اس لفظ کی تکرار اس کے غم کو مندمل کرنے کا باعث بنتی ہے۔ بسا اوقات تو یوں محسوس ہوتا ہے کہ خوشی ایک گنجان باغ ہے۔ پھلوں اور پھولوں سے لدا پھندا..... جہاں راحت ہے، آسودگی ہے نیم خوابیدگی کی لذت ہے۔

زمین کو گلزار بنانے کے لیے بیج بوئے جاتے ہیں لیکن بعض بیج ایسے بھی ہیں جنھیں بویا نہیں جاتا اور بغیر کاشت کیے زمین کی تہہ سے پھوٹتے ہیں اور اسے اپنے وجود سے رنگین کر دیتے ہیں۔ خوشی بھی ایک ایسا ہی بیج ہے جو انسان کے اندر کسی زمین سے پھوٹتا ہے اور اپنے ارد گرد کے ماحول کو منور کر دیتا ہے۔ یہ پودا لمحہ بہ لمحہ بڑھتا چلا جاتا ہے۔ اس کی شاخیں تیزی سے نشوونما پاتی ہیں اور بڑھتے بڑھتے اتنی گھنی ہو جاتی ہیں کہ ایک انبوہِ کثیر اس کی چھاؤں میں آرام کرسکتا ہے۔

خوشی کا حصول مشکل ہو سو ہو لیکن ناممکن ہرگز نہیں۔ خوشی کو پانے کے لیے زیادہ جتن کرنا نہیں پڑتا۔ البتہ نیک فطرت ہونا پڑتا ہے۔ اور یہ بھی ضروری نہیں کہ سب نیک فطرت انسانوں کو خوشی لازمی طور پر ملتی ہو۔ خوشی کا بیج انسان کے اندر سے تو پھوٹتا ہے مگر بیرونی فضا اس کی آبیاری کرتی ہے۔

خوشی کو پانے کے لیے کہیں دور جانے کی ضرورت نہیں۔ بعض مرتبہ تو یوں لگتا ہے کہ خوشی آپ کے کندھے سے کندھا ملائے بیٹھی ہے پھر اُچک کر آپ کی گود میں آ بیٹھتی ہے۔ آپ کی آنکھوں میں سما جاتی ہے اور آپ کے انگ انگ میں اُتر جاتی ہے۔

خوشی ایک ایسا خزانہ ہے جس کو جتنا خرچ کیا جائے کم نہیں ہوتا۔ یہی نہیں کہ خوشی کی دولت ختم نہیں ہوتی بلکہ ہوتا یہ ہے کہ اسے آپ جتنا لوٹائیں اُتنا ہی بڑھتی ہے۔ پھر جن کو آپ خوشی بانٹتے ہیں وہ اُسے تقسیم کرنے لگتے ہیں۔ یوں خوشی کی دولت ایک سے دوسرے، دوسرے سے تیسرے اور تیسرے سے چوتھے کو منتقل ہوتی جاتی ہے۔ خوشی ٹکسال ہے جہاں خوشی کے..... سکے ڈھلتے ہیں اور پھر معاشرے میں تھرکتے، ناچتے چلے جاتے ہیں۔

کل صبح مُنہ اندھیرے جس خوشی سے میری ملاقات ہوئی وہ عام سی، روز مرّہ ملنے والی خوشی تو نہ تھی۔ میں اس کے بارے میں بتاتی ہوں آپ خود اس کا ناک نقشہ وضع کیجیے۔ ورنہ میں تو خود ابھی یہ سمجھنے سے قاصر ہوں کہ کل علی الصبح ملنے والی خوشی کو بیان کروں تو کیسے کروں؟

قصہ یہ ہے کہ مجھے پھول پودوں سے غیر معمولی شغف ہے۔ کسی پودے کی ٹہنی پہ لگا پتاّ بھی غیر ارادی طور پر کسی سے ٹوٹ جائے تو میں غصے سے بھمبیری بن جاتی ہوں۔ پتّا ہاتھ میں پکڑے تلملاتی پھرتی ہوں کہ کسی طرح ٹہنی پہ ٹانک دوں۔ میں یہ بھی پسند نہیں کرتی کہ بلاوجہ کوئی پھول توڑے اور مسل کر پھینک دے۔

ہمسائے کے بچے سکول سے آتے جاتے، راستے کو مختصر کرنے اور دھوپ کی تمازت سے بچنے کے لیے اکثر و بیشتر میرے اس لان سے گزرتے ہیں جس پر میں نے قبضہ جمایا ہوا ہے۔ مجھے تسلیم ہے کہ یہ قطع اراضی وفاقی ترقیاتی ادارے کی ملکیت ہے جسے محکمہ نے جھاڑ جھنکاڑ اُگنے کے لیے آزاد چھوڑ رکھا تھا۔ مگر میں نے اس پر گُل بوٹے اُگا کر اسے چمنستان بنا دیا ہے اور اسی ناتے اس کی رکھوالی بھی میرا فرضِ اولین قرار پایا ہے۔ یہ میرا شوق بھی ہے۔ میں اداس ہوتی ہوں تو پھولوں اور پودوں کی اس محفل میں جا بیٹھتی ہوں۔ پھول مجھ سے باتیں کرتے ہیں۔ مجھے ہنساتے ہیں۔ تب مجھے لگتا ہے خوشی کا ایک مستقل بسیرا پھول اور پودے ہیں۔ جن کے ساتھ بیٹھ کر انسان اپنے دکھ درد بھول جاتا ہے۔ میں ڈالیوں پر لگی ایک ایک کلی گنتی ہوں۔ اس کے کھلنے کے وقت کا اندازہ لگاتی ہوں۔ پھر کلی سے غنچہ اور غنچے سے پھول بننے تک کے مراحل میں اس کے رنگ روپ کا جائزہ لیتی ہوں۔ پھوٹتی ہوئی کونپلوں کے حُسن سے لطف اندوز ہوتی ہوں۔ اور یہ سب نظارہ میرے دل کو خوشی سے بھر دیتا ہے۔ میری اداسی دور ہو جاتی ہے۔

بچوں کے اس لان میں سے ہو کر گزرنے پر تو مجھے مُطلق اعتراض نہیں۔ یہ گُلِ ناطق انسان کی زندگی میں بہار کی نوید ہیں مگر جب کوئی شریر بچہ گزرتے گزرتے کلی چُننے کا شوق بھی پورا کرنے لگتا ہے تو میں جھنجھلا اُٹھتی ہوں۔

کل صبح سورج ابھی نہیں نکلا تھا اور صبح نے سرمئی چادر اوڑھ رکھی تھی، موسم کی خوشگواری روح میں عجیب سی تازگی کا احساس پیدا کر رہی تھی، ٹھنڈی ہوا غیر محسوس انداز میں نرمی سے بہہ رہی تھی، میں نے کمرے کی کھڑکی سے باہر جھانکا تو کیا دیکھتی ہوں کہ ایک ادھیڑ، فربہ اندام شخص تازہ کٹی ہوئی گھاس پر چہل قدمی کر رہا تھا۔ ایک لمحہ... اس شخص کی بے تکلفی پر ابھی میرا پارا چڑھنے کو ہی تھا کہ کسی نادیدہ طاقت

نے مجھے روک دیا اور میں نے جیسے خود سے کہا۔

''بی بی! خدا کا خوف کر! چہل قدمی کرنے والا بھی تو آخر انسان ہے اور خوشی کی تلاش میں تیرے باغ میں آنکلا ہے اور تُو ہے کہ اسے خوشی سے محروم کر دینا چاہتی ہے۔''

معاً میرا غصہ دودھ کے ابال کی طرح بیٹھ گیا۔ مگر میں کھڑکی سے نہ ہٹی۔ چہل قدمی جاری رکھتے ہوئے اس شخص نے موتیا کی ڈالیوں سے چند پھول توڑے اور اپنی ناک سے قریب ہاتھ لے جا کر انھیں سُونگھا۔ وہ توڑے ہوئے موتیا کے پھُولوں سے مشامِ جاں کو مہکاتا رہا اور محوِ گلگشت رہا۔ ادھر میں بھی اپنے دریچے سے محوِ نظارہ تھی۔ چہل قدمی کے عمل سے فارغ ہو کر وہ شخص پلٹا۔ لان کے کنارے پر اُتارے ہوئے جوتے پیروں میں اُڑسے اور ساتھ والی گلی میں داخل ہو کر میری نظروں سے اوجھل ہو گیا۔

تب خوشی کی ایک لہر میرے اندر سے برآمد ہوئی اور مجھ سے گلے ملتی ہوئی میرے ہونٹوں پر آن براجی۔ پھر دوسرے ہی لمحے وہ میری پلکوں پر آ بیٹھی۔ میں بھی اس کیفیت کو سمجھ نہ پائی تھی کہ خوشی میرے دل میں اُتر گئی اور میرا انگ انگ جھوم اُٹھا۔ خوشی کے اس رُوپ سے آج تک میرا سامنا نہیں ہوا تھا۔ خوشی سے ملنے کا یہ ایک بالکل انوکھا اور نیا تجربہ تھا۔ خوشی نے مجھے سرشار کر دیا تھا۔

میرا وہ باغ جس پر ہر مہینے پورے ڈھائی سو روپے میں اپنی گرہ سے مالی کو ادا کرنے کے علاوہ ذاتی طور پر اپنا نہایت قیمتی وقت بھی صرف کرتی ہوں اور جس کے لیے موسمی بیج پودے نقد خریدتی ہوں اور یوں جس باغ کو ذاتی ملکیت تصور کرتی ہوں پہلی مرتبہ اسے کسی اور کے تصرف میں دیکھ کر نئے اور انوکھے جذبے سے خود کو سرشار پایا۔ آج سے پہلے خوشی نے یوں میرے دل کو کبھی شاد نہ کیا تھا۔ یہ خوشی ایک نئے اور مختلف انداز میں مجھ سے ملی تھی خوشی کا یوں ملنا تھا کہ غور و فکر کے در مجھ پر کھُلتے چلے گئے۔ یکا یک مجھے لگا کہ لان پھولوں کی کیاریوں سے نہیں سجا بلکہ خوشی کے خزانے سے بھرا ہوا ہے۔ جو اسکول سے آتے، دُھوپ میں جھُلستے بچوں کی جھولیاں آسودگی سے بھرتا ہے راہ چلتے راہ گیروں کو طمانیت سے مالا مال کرتا ہے، تھکے ہارے مزدور، سواری کے منتظر ٹیکسی ڈرائیور اور بس کی راہ تکتے مسافر جب میرے لگائے ہوئے درختوں کے سائے میں کھڑے ہوتے ہیں تو خوشی کی لہریں مجھے اپنے اندر سے اُٹھتی محسوس ہوتی ہیں۔ اور مجھے زندگی بہت خوبصورت دِکھنے لگتی ہے۔ میں سوچتی ہوں دوسروں کو خوشی بانٹ کر خوشی کتنی بڑھ جاتی ہے۔ مجھے لگتا ہے خوشی ہلکی بارش کی پھوار کی طرح مجھ پر برس رہی ہے اور میں خوشی کی ننھی ننھی زم زم بوندوں میں بھیگتی جا رہی ہوں.... بھیگتی جا رہی ہوں خوشی ایسا انمول خزانہ ہے۔!

خالد صدیقی

لکیر

جب بھی میں کسی آرٹ گیلری میں مصوّری کے فن پاروں کی نمائش میں حسین تصاویر کو دیکھتا ہوں تو مجھے محسوس ہوتا ہے کہ مصوّر نے جس کمال مسیحائی سے لکیروں کے خدوخال میں مصوّری کے رنگوں کی رُوح ڈالی ہے اُس سے یہ فن پارے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے زندہ ہو گئے ہیں۔ تصویروں کے دلکش نقوش دیکھ کر میرے اندر لطیف احساسات کی لہریں موجزن ہوتی ہیں اور مجھے بھی اپنے زندہ ہونے کا احساس ہوتا ہے۔ میرا دل چاہتا ہے کہ میں اُس تصویر سے جی بھر کر باتیں کروں جس کی تخلیق میں اُس کے خالق کا ہُنر، سچی لگن اور محبت شامل ہے، کیوں کہ ہر خالق اپنی تخلیق سے حد درجہ عشق رکھتا ہے اور اُسے اپنی تخلیق حقیقت سے قریب، سچائی کے نُور میں ڈھلی ہوئی نظر آتی ہے۔ میں آرٹ گیلری کے پُرسکون ماحول میں فریم شدہ تصویر کو اپنی سمجھتا ہوں اور اس کی زندگی سے بھرپور مُسکراہٹ کے عقب میں بولتی لکیریں اور مُسکراتی آنکھیں مجھے اپنا گرویدہ بنا لیتی ہیں۔

سچ تو یہ کہ لکیر نے فن کو جنم دے کر اور ماں کی طرح پرورش کر کے اُسے رہتی دُنیا کے لیے اَمر بنا دیا ہے۔ آخر مونالیزا کی مُسکراہٹ جو نجانے کتنے عرصے سے لوگوں کے دلوں پر حکمرانی کرتی رہی ہے ایک متوّر لکیر ہی تو ہے جس نے مونالیزا کو زندۂ جاوید کر دیا ہے۔

میں اپنے اُس ادیب دوست سے قطعی اتفاق نہیں کرتا جس کا کہنا ہے کہ مصوّر رنگوں کے بُرش کی آڑ میں تصویر کے خدوخال کو غائب کر دیتا ہے۔ لکیر تو زندگی کی علامت ہے اور زندگی سے مکمل طور پر ہم آہنگ ہے اور یہ ہم آہنگی کارڈیولوجی کے مظہر میں بخوبی نظر آتی ہے اور پھر لکیر کے چھپے ہوئے رُوپ کو دیکھنے کے لیے تو حُسنِ نظر اور ظاہری آنکھ کے علاوہ باطنی آنکھ بھی چاہیے۔ اگر آپ ان اوصاف کے حامل ہیں تو سمجھ لیجیے کہ آپ کے اندر مصوّر کی صورت میں ایک ولی کامل چھپا بیٹھا ہے۔

لکیر ایک زندہ و متحرک شے ہے اگر لکیر زندہ نہ ہو تو مصوّر کا سارا تخلیقی حُسن بے جان ہو کر رہ جائے اور پھر یہ تو ہر رُوپ میں نظر آ کر آپ کا دل موہ لیتی ہے۔

لکیر تو کچا مواد ہے آپ جیسے چاہیں اسے استعمال میں لائیں یہ گیلی مٹی کی طرح مختلف سانچوں میں ڈھلنے کے لیے ہمیشہ تیار رہتی ہے، بالکل اسی طرح حالات کے مختلف رویوں کے ساتھ چلنا اور اپنے آپ کو ڈھالنا بھی گیلی مٹی کے سانچے کی طرح ایک عملی مظہر ہے۔ یہ زبان بھی رکھتی ہے آپ اس کے جتنا قریب آتے ہیں اور اس کو پہچاننے کی کوشش کرتے ہیں یہ اُتنا ہی آپ کو اعتماد میں لیتے ہوئے سب کچھ بتانا شروع کر دیتی ہے۔ جب آپ کسی مسئلہ سے دوچار ہوتے ہیں تو آپ کے ماتھے پر اُبھری ہوئی لکیریں آپ کے اندر کے جوار بھاٹا کی کیفیت کو پُور ے جمالیاتی حُسن کے ساتھ تصویری زبان میں بتانا شروع کر دیتی ہیں۔ آپ اپنے اندر کے جذبات و احساسات کو چھپانے کی لاکھ کوشش کرتے ہیں مگر چہرے کے فریم پر نمودار ہونے والی لکیریں آپ کے جذبات کو عُریاں کر دیتی ہیں اور تو اور وقت کے ساتھ ساتھ چہرے پر پڑنے والی جھریاں اپنے اندر بے شمار حسین یادوں، تجربات اور مشاہدات کو چھپائے ہوتی ہیں اور پھر انسان کی پوری تاریخ اس ہیروگرافی تحریر میں مقیّد نظر آتی ہے۔

لکیر اگر سیدھی ہو تو صراطِ مستقیم ہے۔ اس کا ایک باقاعدہ آغاز اور انجام ہے، انسان کا عدم سے ہست کی طرف آنا اور پھر واپس عازمِ سُوئے عدم ہونا آغاز سے انجام کی طرف ایک سیدھا سفر ہی تو ہے۔ یہی لکیر اگر دائرے کی شکل اختیار کرے تو ابدیّت کی مظہر ہے لیکن اگر جزرومد کا منظر دکھائے جیسے سمندر کی موج تو وقت کی دھڑکن بلکہ دل کی دھڑکن بن جاتی ہے۔ لکیر پابند بھی کرتی ہے اور آزاد بھی، ہر دائرہ، ہر مثلث، ہر مربع لکیر سے بنے ہوئے پیکر ہیں اور ہر تہذیب نے اپنے لیے ایک خاص قسم کے پیکر کا انتخاب کیا ہے۔ دائرہ والی تہذیب ہمہ اُوست پر منتج ہوتی ہے اور سیدھی لکیر توحید کے اقرار پر جب کہ، مثلث والی تہذیب ترمُورتی یا باپ، بیٹا اور روح القدس کی تثلیث پر اُستوار ہے اور تو اور اتحاد، یقین، تنظیم، کی ہمہ گیریت مثلث ہی کی ایک صورت ہے۔ مربع والی تہذیب چار عناصر پر مشتمل ہے جن میں تین کونے روایتی اور چوتھا کونا پُر اسرار ہے، یہی چوتھا کھونٹ ہے، جس تہذیب میں چوتھا کھونٹ نمودار ہو وہاں فنونِ لطیفہ کو، ایجادات کو نئے نئے نظریوں کو فروغ ملتا ہے۔

غور کیجیے کہ دنیا کی تمام زبانوں کے رسم الخط میں نقطہ، لکیر اور قوس مثلث کی صورت میں اپنے حُسن کے تناسب سے نظر آتی ہیں، گویا لکیر ہی تمام زبانوں کی ارتقا کی مظہر اور اُن کی ماں ہے۔

کبھی آپ نے سوچا کہ خود لکیر کیا ہے؟ لکیر تو اُس دبلی پتلی دوشیزہ کی طرح ہے جس کے اندر بجلیاں بھری ہوں اور پھر یہ زمان و مکان کی مسافتوں سے کبھی نہیں گھبراتی بلکہ ایک پیہم جدوجہد کی

علامت ہے۔نقطہ اگر چمکتا اور دمکتا ہے تو لکیر تبسم فرماتی ہے۔اسی چمک دمک اور تبسم کے کھیل کی وجہ سے
کائنات میں نور اور رعنائیت نظر آتی ہے، آپ چاہے آسمان پر ستاروں کے لامتناہی سلسلے پر ایک نظر ڈالیں
یا چاند کے رُخِ زیبا سے پھُوٹ کر آنے والی کرنوں کو دیکھیں یا صفحہ، خاک پر کھنچی ہوئی دریاؤں اور
ندیوں کی لکیروں پر نظر ڈالیں آپ کے اندر چھپے ہوئی جمالیاتی ذوق کے ساز خود بخود بجنے لگتے ہیں آپ
کا انگ انگ جھو منے لگتا ہے۔آپ کو ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے آپ کے چاروں طرف ذرّہ ذرّہ جھوم
جھوم کر موسیقی نشر کر رہا ہے اور لہک لہک کر لکیر کے طفیل ایک مرکز بنا کر گردشِ دوام کے مزے لوٹ رہا
ہے اور ساتھ ہی سراغِ زندگی کا پتا بھی دے رہا ہے۔

میں روزانہ اپنے اردگرد جتنی بھی شکلیں دیکھتا ہوں وہ سب لکیروں ہی کے حصار میں ہیں، خود
گھر بھی تو ایک حصار کا نقشہ ہے جس کے دروازے میں داخل ہوتے ہی مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے
میں کسی گوشۂ عافیت میں داخل ہو رہا ہوں، باہر کی مکار اور ڈراؤنی شکلیں اب میرا کچھ نہیں بگاڑ سکتیں۔
جہاں ہر شے ہونٹوں پر مسکراہٹ بکھیرے مجھے خوش آمدید کہہ رہی ہے، انسان باہر کتنا ہی اُودھم مچائے
نعرہ بازی کرے مگر تھک ہار کر اپنے ہی تعمیر کردہ حصار کی پناہ میں آ کر طمانیت حاصل کرتا ہے اور اپنی
پھُولی ہوئی سانسوں کی روا رکھتا ہے، گویا حصار ہی اس کی آخری پناہ گاہ اور آرام گاہ ہے اور تو اور حصار
ایک تربیت گاہ بھی ہے جس کے اندر قدم رکھتے ہی گنوار پن کا میل اُتر جاتا ہے اور جسم ہلکا پھلکا ہو جاتا
ہے، جسم کے مسام کھُل کر تہذیب کی شعاعوں کو اپنے اندر داخل کرنا شروع کر دیتے ہیں۔یہی حال
چوپایوں کا ہے' وہ بھی استاد کی چھڑی کے اشاروں کو سمجھتے ہوئے تہذیبی عمل سے گزر کر فرماں برداری سے
اپنے آپ کو اپنے مالک کی رضا کے حوالے کر دیتے ہیں۔

سیدھی لکیر کا کاروبارِ حیات کے لیے مفید ہے، اس سے شہروں، درختوں، انسانوں اور
معاشروں کو ایک خاص ترتیب میں باندھا جاتا ہے۔ساری اخلاقیات سیدھی لکیر کے تابع ہے مگر فن
سیدھی لکیر کا نہیں بلکہ قوس کا طلب گار ہے۔مصوّری کا ہر شاہکار اور حُسن کا ہر منظر قوسوں سے بنتا ہے
سیدھی لکیروں سے نہیں، سیدھی لکیر سے ڈرائنگ جنم لیتی ہے قوس سے مصوّری پیدا ہوتی ہے۔چہرے
اور بدن کا حُسن قوسوں کے باعث ہے نہ کہ سیدھی لکیروں کے باعث، قوسوں کی تربیت کا تناسب ہی
حُسن میں چار چاند لگا دیتا ہے اور مصوّری کی داد پاتا ہے۔اور شاید یہی وجہ ہے کہ ہر عورت قوس کے
استعمال میں خاصی سنجیدہ اور باذوق رہتی ہے۔اپنے چہرے کے خدوخال کو پُر کشش بنانے کے لیے

مصنوعی بھنویں تو ایسی مہارت اور نفاست سے بنائی جاتی ہیں کہ بے چارے مرد کا دلِ ناتواں اِن کالی قوسوں میں اُلجھ کر حورانِ خُلد کی فکر سے بے نیاز ہو جاتا ہے اور جب یہی لکیریں ایک خاص کلچر اور تہذیب کی نمائندگی کرتے ہوئے چہرے اور جسم پر نظر آتی ہیں تو ہندو برہمن اور ریڈ انڈین اپنی پوری تاریخ سمیت نظروں کے سامنے آجاتے ہیں۔

لکیر ہر امتیاز سے بے نیاز ہر ایک کی ہے اور بس انگلیوں کے اشارے کی منتظر رہتی ہے اور جوں ہی یہ وجود میں آتی ہے کورے کاغذ کی قیمت بے حساب ہو جاتی ہے۔ آرٹ اور ڈرائنگ کے علاوہ تحریر کے جھروکوں سے بھی مسکراتی ہوئی نظر آتی ہے اور تو اور جب کوئی جملہ کسی کی خاص توجہ چاہتا ہے تو اُسے انڈر لائن کر دیا جاتا ہے، اور اگر کوئی جملہ افسرِ مجاز کی طبع نازک کے لیے بارِگراں ہو جائے تو ایک ہی لکیر اُس جملے کا کام تمام کر دیتی ہے۔ لکیر گراف کی صورت میں منصوبہ سازوں کے لیے ہر وقت ایک معما بنی رہتی ہے۔ میں اپنے ایک دوست کو جانتا ہوں جو ہر روز خرچہ اور آمدنی کے گراف میں اُلجھا رہتا ہے اور اِسی اُلجھن کی وجہ سے اس کے سر کے بالوں کی آبادی کا گراف تیزی سے نیچے کی طرف آتا جا رہا ہے اور یوں اُس کے چہرے کی تہذیب اور جنگل کی حدود کے آثار مٹتے جا رہے ہیں۔

جب میں ننھے معصوم بچوں کو ٹیڑھی ترچھی لکیریں کھینچتے ہوئے دیکھتا ہوں تو مجھے محسوس ہوتا ہے کہ انسانی ذہن کی رفعتوں کا پہلا قاعدہ لکیر ہی ہے۔ یہی لکیر مختلف رُوپ میں اجاگر ہو کر بچے کے ذہن کے دریچے کھولتی ہے۔ لکیر کا سب سے بڑا احسان یہی ہے کہ یہ نقطہ سے اپنا سفر شروع کرتی ہے اور ٹیڑھی ترچھی شکل میں بچے کی پنسل کے ساتھ ساری عُمر چلتی رہتی ہے۔ میں جب کسی شخص کو ٹیلیفون پر بات کرنے کے دوران میں ٹیلی فون ڈائریکٹری یا کسی کاغذ پر لکیروں سے کھیلتا ہوا دیکھتا ہوں تو میرا یہ احساس پختہ ہو جاتا ہے کہ ہر انسان کے اندر ایک بچہ ہے اور بچے کے اندر لکیر چھپی بیٹھی ہے۔ شاید بچہ خود بھی ایک لکیر ہے۔

جب میں صبح کے وقت روشندان یا کھڑکی کے راستے سورج کی کرنوں کو کمرے کے اندر آتے ہوئے دیکھتا ہوں تو مجھے کمرے کے اندر موجود مٹی اور گرد کے رقص کرتے ہوئے آوارہ ذرات روشنی کی ان لکیروں کے سامنے عُریاں نظر آتے ہیں اور اُن کا خاموش رقصِ آوارگی انتہائی بھلا لگتا ہے اور میں دیر تک اِردگرد کے ماحول سے بے نیاز اُس کی دلفریبی میں اس حد تک کھویا رہتا ہوں کہ مجھے احساس ہی نہیں ہوتا کہ میری ذات بھی روشنی کے سامنے عُریاں ہو کر رقص میں مصروف ہے۔ جوں ہی میں احساس کی

دنیا میں واپس آتا ہوں تو مصلحتوں کی چادر اُوڑھ کر ایک نئے رقص کے لیے گھر سے باہر نکل جاتا ہوں۔ مصلحتوں کے پیچھے بے لگام دوڑنا، خوشامد کے لیے چکر لگانا ایک طرح کا رقص ہی تو ہے جس کے دائرے میں میں عرصہ دراز سے گھوم رہا ہوں۔

میں خارجی طور پر کائنات کی رفعتوں کی طرف نظر دوڑاتا ہوں تو مجھے پتا چلتا ہے کہ کائنات کا سارا انظام ہی لکیروں کی گردش کے بل بوتے پر چل رہا ہے گویا ہر چیز حالت سفر میں ہے اور پھر مسلسل سفر ایک گردش ہی تو ہے، کسی نے کیا خوب کہا ہے کہ سفر وسیلۂ ظفر ہے، سفر ہی کے ذریعے آدمی صحیح طرح سے پہچانا جاتا ہے، اگر حقیقت کی عینک سے دیکھا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ زندگی کا سارا سفر ہی لکیر کی معیت میں ہو رہا ہے مگر لکیر یہ نہیں کہتی کہ میرے لیے فقیر بن جاؤ بلکہ وہ تو کہتی ہے کہ مجھے سمجھنے کی کوشش کرو اور پھر دیکھو کہ میں کیا ہوں یا کیا نہیں ہوں۔۔۔۔؟

☆☆☆☆

حنیف باوا

میرا گھر

پرندوں کا گھونسلے بنانا ایک فطری عمل ہے۔اس میں ان کے شعور کو کوئی دخل نہیں۔یہی وجہ ہے کہ ان کے پاس میرا اور تیرا کا کوئی تصور نہیں۔وہ گھر بناتے ہیں،اپنے بچوں کو پالنے کے لیے۔جب بچے اپنا رزق تلاش کرنے کے قابل ہو جاتے ہیں تو وہ اپنے گھونسلوں کو دوسرے پرندوں کے ہاتھ بیچ کر نہیں جاتے۔نہ ہی وہ انھیں پیوند خاک کر کے جاتے ہیں،وہ انھیں اس طرح چھوڑ کر چلے جاتے ہیں جیسے کبھی ان میں رہائش پذیر ہی نہ ہوئے ہوں۔پہلے پہل میں پرندوں کی اس روش کو اپنائے ہوئے تھا،لیکن جب سے میں نے اس روش کو ترک کر کے شعور کے کہنے پر ٹھکانے کو گھر کا نام دیا ہے اور اِسے خوب تر بنانے کے چکر میں پھنسا ہوں،میں بہت سے بکھیڑوں میں گرفتار ہو گیا ہوں،جس وقت میں نے اپنی رہائش گاہ کو کوئی نام نہیں دیا تھا،میرے اندر محبت کا دیا سدا روشن رہتا تھا،اور میں اپنے قبیلے کے دوسرے افراد کے ساتھ بھائی چارے کی فضا میں زندگی بسر کرتا تھا۔یہ اس وقت کی بات ہے،جب قبیلے کے نوجوان جانوروں کا شکار کر کے لاتے اور کنبے کے تمام افراد مل کر کھاتے تھے۔اس زمانے میں امیر،غریب،چھوٹے بڑے،کمزور اور طاقتور کا کوئی تصور نہیں تھا،جب سے میں نے دیواروں میں گھرے اپنے اس ٹھکانے کی پیشانی پر اپنے نام کی تختی سجائی ہے،ان لفظوں نے مجھے پوری طرح اپنی گرفت میں لے لیا ہے۔

دراصل چار دیواری میں گھرا ہوا زمین کا یہ ٹکڑا جو میں نے اپنے لیے مخصوص کر رکھا تھا۔اس وقت میرا گھر کہلانے کا مستحق ہوا،جب تمام ضرورتیں اپنے ہاتھ سے گھڑے ہوئے سکے کے تابع ہو گئیں۔جیسے جیسے یہ سکہ میری جیب کو بھاری کرتا گیا۔میں دوسروں سے بچھڑتا گیا۔اس طرح میرا اور تیرا کا تصور اُبھر کر سامنے آ گیا۔میرے اور تیرے کے اس تصور نے کچھ اس انداز سے سکہ سے ناتا جوڑا کہ میں اس کے جال میں پھنس گیا اور دوسروں سے کٹ کر رہ گیا۔یہ میرے تنہا ہونے کی ابتدا تھی۔یہ تنہائی میرے لیے اذیت کا باعث اس لیے بنی کہ میں کلی طور سکے کی پناہ میں آ گیا تھا۔اب یہ سکہ مجھے سکون تو

دیتا ہے، لیکن یہ سکون اس کبوتر کے سکون جیسا ہے، جو بلی کے سامنے آجانے سے آنکھیں بند کر کے وہ محسوس کرتا ہے۔

میرا اور تیرا کے اس تصور نے دو بھائیوں ہابیل اور قابیل کے درمیان اس قدر بُعد پیدا کر دیا کہ بالآخر ایک نے دوسرے کو موت کے گھاٹ اُتار دیا، دنیا میں یہ پہلا قتل تھا، جو حقِ ملکیت جتانے کا ثمرہ تھا۔

یہ بات روزِ روشن کی طرح عیاں ہے کہ انسان اپنی رہائش گاہ کو جتنا بلند کرتا جاتا ہے، اتنا ہی دھرتی میں گہرا گڑھا پڑتا جاتا ہے، دنیا میں استحصال کی یہ ادنیٰ سی مثال ہے، میں دوسروں کے بارے میں بالکل بات نہیں کروں گا چاہے دھرتی کو تہہ و بالا کرتے ہوئے تحت الثریٰ تک پہنچ جائیں میری بلا سے۔ میں تو اپنے گھر کے بارے میں کچھ عرض کروں گا۔ میرا گھر گھاس پھوس کی بنی ہوئی اس کُٹیا کی مانند ہے، جس میں کسی صوفی کا بسیرا ہو۔

میرا گھر نہایت ہی خستہ حالت میں ہے، پھر بھی میں اسے حقِ ملکیت کی قید سے آزاد کرنے پر قادر نہیں ہوا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ میرے اندر وہ تمام آلائشیں موجود ہیں جو مجھے دنیاداری کے دائرے سے کبھی باہر نہیں نکلنے دیتیں۔ اس کے برعکس صوفیا کو لیجیے وہ اپنی کٹیاؤں پر اپنا حق کبھی نہیں جتاتے اس کی وجہ یہ ہے کہ ان کے ظاہر اور باطن میں کوئی بُعد نہیں ہوتا۔ میں یہ کہہ کر خود کو صوفی ثابت کرنے کی ہرگز کوشش نہیں کر رہا، دراصل میں اپنے گھر کو صوفی کی کٹیا سے ہم رشتہ کر کے اپنے لیے کچھ تسکین کا سامان پیدا کر رہا ہوں، حالاں کہ یہ اس وقت تک ممکن نہیں جب تک کہ میرے اندر کی کوٹھی صاف نہ ہو جائے۔ اسے میری کم ہمتی یا تاریخ کے سیاہ حروف کا جبر کہہ لیں کہ میں ابھی تک اپنے اندر سے میں کو نکال باہر نہیں کر سکا۔ اس لیے جب بھی میں دوسرے دنیاداروں کی طرح گھر سے باہر نکلتا ہوں میرے ظاہر اور باطن باہم دست و گریباں ہونے لگتے ہیں جب ان کی لڑائی مجھے ننگا کرنے لگتی ہے تو میں بھاگ کر گھر کی پناہ میں آجاتا ہوں لیکن میرے گھر کے تمام گوشے تو دیمک زدہ کھڑکیوں اور دروازوں سے باہر جھانکتے رہتے ہیں۔ اس طرح بھلا میں گھر میں رہتے ہوئے بھی ننگا ہونے سے کیسے بچ سکتا ہوں۔ ننگے تو وہ بھی ہیں جن کی دیواروں پر سنگِ مرمر کی سلیں نصب ہیں اور جن کے آہنی دروازے مکروہ ہونٹوں کی طرح سلے رہتے ہیں۔ میری دانست میں ہم اس وقت تک برہنگی کے عذاب میں مبتلا رہیں گے جب تک کہ ہم اپنے ظاہر اور طاطن کی جنگ کو دور کر کے ان میں معانقہ نہیں کرائیں گے۔

اب تک میں نے عینک کا صرف کا بایاں شیشہ ہی استعمال کیا ہے جس کی روشنی کائنات کے باطن کو کھنگالنے تک محدود ہے۔ اب میں عینک کا دایاں شیشہ دائیں آنکھ کے سامنے کرتا ہوں۔ وہ دیکھو ہر طرف روشنی ہی روشنی ہے۔ ہر سمت گہما گہمی، ہر قدم پر دمکتے چہرے، رنگوں کا سیلاب، بلند و بالا خوبصورت عمارتیں جو اپنی انفرادیت کے نشے میں چُور آسمان سے باتیں کر رہی ہیں۔ ان عمارتوں کے قدموں میں کچھ ایسے جھونپڑے بھی ہیں جو ان عمارتوں کے آگے بچھے جا رہے ہیں۔ میں سمجھتا ہوں کہ دنیا کی یہ تمام رونقیں، تمام خوبصورتیاں، رنگینیاں، جھمیلے اس دن سے روز افزوں ہیں جس دن سے میں نے زمین کے ایک چھوٹے سے ٹکڑے کو چار دیواری کی پازیب پہنا کر اس کے ماتھے کو اپنے نام کی تختی سے سجایا ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ اگر یہ تختی میرے گھر کے ماتھے کا جھومر نہ بنتی تو میں آج اپنے برہنہ جسم کو درختوں کی چھال سے ڈھانپ کر صدیوں پہلے کے اندھیرے غاروں میں رہ رہا ہوتا۔ مگر (اب میں عینک کے بائیں شیشے کو دوبارہ استعمال کر رہا ہوں) کیا میں اور میرے جیسے لاکھوں لوگ آج بھی غاروں کے باسی نہیں ہیں؟ مجھے تو عینک کے بائیں شیشے سے ایسا ہی نظر آ رہا ہے۔

☆☆☆☆

ڈاکٹر ناصر عباس نیر

کائنات بوڑھی نہیں ہوتی

آج جب میں رات کو عبور کر کے صبح تک پہنچا اور میری خوابیدہ آنکھیں اندر کے منتشر عالم سے باہر کی طرف اُٹھیں تو ان کی تھکن اور بڑھ گئی۔ سب کچھ پرانا اور بوسیدہ لگا۔ سورج بوڑھا اور خون کی کمی کا شکار محسوس ہوا جو لاٹھی ٹیکتے ہوئے دن کے پہاڑ پر ہانپتے ہوئے چڑھ رہا تھا۔ ہوا کی کمر بھی نقاہت اور عمر کی زیادتی سے جھکی ہوئی تھی اور اس کے سانسوں میں عہد کہولت کی مخصوص باس رس بس چکی تھی۔ درخت بھی نڈھال تھے اور ان پر بیٹھے پرندے مسلسل جمائیاں لے رہے تھے اور سب لوگوں کے چہروں پر کھنڈر عمارتوں کی سی ٹوٹی بکھرتی کہنگی مسلط تھی۔ مجھے لگا جیسے یہ ساری کائنات ایک بڑا غار ہے جس میں یہاں سے وہاں تک ایک ملگجی پر ہیبت فضا کا راج ہے اور جس میں جا بجا جالے لٹکے ہیں اور جو آسیب زدہ ہے۔ میں تازہ ہوا کے لیے لمبے اور گہرے سانس کھینچتا ہوں مگر میرے سینے کی حبس زدگی اور بڑھ جاتی ہے اور لگتا ہے کہ باہر کا غار میرے اندر کھنچتا چلا آیا ہو اور پھر دفعتاً ایک کاٹتی ہوئی لہر میرے اندر اٹھتی ہے مجھے محسوس ہوتا ہے، میں اس غار میں قید ہوں۔ ایک لمحے کے لیے میرا دم گھٹنے لگتا ہے۔ زندگی اور موت کے درمیان کی موہوم لکیر پوری طرح روشن ہو جاتی ہے اور محض ایک قدم کا فاصلہ لگتی ہے۔ میرے لیے یہ گھڑی بہت قیمتی اور نادر ہوتی ہے کہ میں اس گھڑی پوری طرح بیدار ہو جاتا ہوں۔ ہر چند اس لمحے میں ایک دہشت سمائی ہوتی ہے، مگر شاید یہی دہشت میرے اعصاب اور میرے احساسات پر آکاس بیل کی طرح لپٹی اور ان کا خون چوستی، غنودگی کو ایک پل میں جھٹک ڈالتی ہے۔ مجھے موت اور زندگی کی درمیانی لکیر ان دودھیا نقطوں کا سلسلہ دکھادیتی ہے جو روشن اور تاریک جہانوں کی سرحدی لائن ہیں۔ اس کے ساتھ ہی میری قید کی زنجیر کی ایک کڑی ٹوٹ جاتی ہے اور یہ بات مجھے اپنے اختیار میں محسوس ہوتی ہے کہ میں سرحدی لائن کے اِس طرف یا اُس طرف قدم رکھوں۔ چاہوں تو فقط ایک جست بھر کر تاریکیِ عدم میں خود کو تحلیل کر لوں اور نہ صرف ''خود'' سے نجات، بلکہ نجات کے تصور سے بھی نجات پالوں۔ اختیار کا یہ احساس میرے لیے ایک قوت بخش معجون کا کام کرتا ہے اور میرے ذہن میں یہ علم

روشن ہو جاتا ہے کہ گھنے تاریک جہان کی طرف بالآخر اور بہر طور مجھے جانا ہے اور کبھی کو جانا ہے اور قید اور قید کے احساس سے بہر کیف رہائی مل جاتی ہے۔ اس لیے اپنی توانائی کو اس سمت کے خوف یا اس سمت کے ارادی سفر میں ضائع کر ڈالنا سراسر حماقت ہے اور فطرت بہر حال اتنی مہربان نہیں ہے کہ وہ اس حماقت کو معاف کر دے۔

اب یاد آنے لگتا ہے کہ مجھے اپنے اندر اور باہر کے پرانے مہیب غار کی موجودگی کا احساس وقفے وقفے سے ہوتا رہا ہے۔ میرے بدن پر نصب پانچوں کھڑکیوں پر گرد جم جاتی ہے اور جالے بن جاتے ہیں اور پھر سب کچھ کہنہ اور گرد آلود ہو جاتا ہے۔ اس خیال سے میری قید کی زنجیر کی ایک اور کڑی ٹوٹ جاتی ہے۔ میرے لیے یہ احساس پُر مسرت ہوتا ہے کہ اس کائنات میں اس واحد نوع کا فرد میں ہی ہوں جو موجود کے استبداد کا سامنا کرنے کے بیسیوں گُر جانتا ہے۔ کبھی وہ موجود کی تہ میں اتر جاتا ہے اور یوں کھردری بالائی سطح کے نیچے جو ملائمت ہے اسے مَس کر لیتا ہے اور کبھی موجود سے ماورا ہو جاتا ہے اور اپنا ایک موجود تخلیق کر لیتا ہے جو اس کی خوشیوں اور اُمیدوں کا علمبردار ہوتا ہے اور کبھی موجود کی چھوٹی سی گیند بنا کر اُسے دیوارِ آفاق سے پٹخ دیتا اور بچے کی طرح اس کا تماشا کرتا اور لطف اندوز ہوتا ہے۔ اور کبھی موجود کی ضرورت ہی سے یکسر بے نیاز ہو جاتا ہے..... یہ خیالات میرے حواس کی کھڑکیوں پر پڑی گرد کو رفتہ رفتہ ہٹاتے جاتے ہیں اور غار کے جالے بھی صاف ہونا شروع ہو جاتے ہیں۔ ہوا کے سانس بھی مہکنے لگتے ہیں اور سورج کا چہرہ بھی تمتمانے لگتا ہے۔ اور میں سوچتا ہوں، کائنات بوڑھی نہیں ہوتی، میں ہی مضمحل ہو جاتا ہوں۔ یہ کائنات تو حد درجہ خلیق اور میری غم گسار ہے اور بہت ہمت والی ہے۔ یہ اپنے دُکھ کو کسی لمحے اور کسی شکل میں ظاہر نہیں ہونے دیتی۔ اس پر جو کبھی کبھی اِضمحلال طاری ہوتا ہے وہ دراصل میرے دُکھ کی وجہ سے ہے۔ سانس میرا پھولتا ہے تو قدم اس کے ڈگمگانے لگتے ہیں۔ اشک میری آنکھوں سے گرتے ہیں تو چہرہ اس کا بھیگ جاتا ہے۔ مجھے خیال آتا ہے اگر دوبارہ کبھی Big Bang ہوا اور پہاڑ رُوئی کے گالوں کی طرح، آوارہ اور برباد حالت میں اُڑے تو ایسا اس لیے ہوگا کہ کائنات کا باطن انسانوں کے دُکھوں سے بھر کر چیخ جائے گا۔ حشر دراصل ہمارے دکھوں پر کائنات کا ماتم ہوگا۔ مگر یہ کائنات بہت بڑی ہے اور اس کا ظرف اس سے بھی بڑا ہے۔ اس لیے ہمارے دل کے داغوں سے اس کا سینہ شاید ہی پھٹے! اس بات کا امکان اس لیے بھی ہے کہ کائنات داغ کو نقطۂ نور بنانے کی بے مثال صلاحیت رکھتی ہے اور اِس جہان میں انسانوں کے عظیم اور ابدی دُکھوں کے باوجود یہ جو روشنی اور تازگی

نظر آتی ہے، اِسی تخلیقی صلاحیت کی وجہ سے ہے۔ کائنات نئی نویلی دُلھن کی طرح ہے جو ہر روز سنگھار کرتی ہے اور اس کا ہر دن جو پہلے سے زیادہ چمکیلا اور نکھرا ہوا اور تازہ تازہ استری شدہ سفید کاٹن کے سوٹ کی طرح ہوتا ہے تو اس لیے کہ یہ تاریکی کو روشنی میں بدلنا اور اپنی اس کامیابی پر مُسکرانا جانتی ہے۔

یہ ننھے ننھے خیالات میری ذات کی منڈیر پر حسین پرندوں کی طرح برابر اُترتے جاتے ہیں اور میں صبح کے اوّلین لمحوں میں جس بیزار کن کیفیت میں گرفتار تھا، اس کا استبداد کم ہونے لگتا ہے۔ زنجیر کی سب کڑیاں ایک ایک کر کے ٹوٹتی چلی جاتی ہیں۔ اور میں سوچتا ہوں: آدمی کی بڑی بڑی خوشیاں ننھے ننھے خیالات سے کس قدر جڑی ہوئی ہیں! آدمی چاہے تو اِسی ننھی مخلوق سے تمام بڑے سانحوں اور المیوں کی فوجِ ظفر موج کے دانت کھٹے کر سکتا ہے۔ یزداں تک کو شکار کر سکتا ہے۔ سب کچھ کر سکتا ہے۔ ہر بڑا دُکھ کترنوں سے بنی ہوئی گیند ہوتا ہے۔ ایک ننھے سے خیال کی مدد سے ایک کترن ہاتھ میں آ جائے تو ساری گیند کُھل جاتی ہے اور آدمی دُکھ کی اِس ہیئت کذائی پر ہنس سکتا ہے۔ بس ان خیالات کی آمد کا راستہ کھلا رہنا چاہیے۔ صبح جب میں بیدار ہوا تو دراصل یہ راستہ بند تھا۔ میں رُکا ہوا تھا اور میرے ساتھ سب کچھ Still ہو گیا تھا۔ اور اب جب کہ میرے راستے کی رکاوٹیں دُور ہو گئی تھیں اور میری روانی بحال ہو چکی تھی تو ہر شے نے اپنی مخصوص رفتار پکڑ لی تھی ۔ ایک مہربان چہرہ، یہاں وہاں سب جگہ نظر آ رہا تھا، جس کی پُر اِلتفات نظروں کی زد پر میں کھڑا ہوا تھا۔

☆☆☆☆

پروین طارق

بولتے سناٹے

یہ رات، پچھلے پہر کی بات ہے۔ ختم نہ ہونے والی خاموشی فضا پر مسلّط تھی۔ پھر اس خاموشی کے بطن سے سناٹوں کی آواز سنائی دینے لگی اور میں روزِ آفرینش کے بارے میں سوچنے لگی! جب کچھ نہ تھا تو ضرور خاموشی ہوگی۔۔۔اور ہر طرف ہُو کا عالم ہوگا۔۔۔اُس پراسرار خوموشی لازماً سناٹے ہی ہوں گے جو فضا پر مسلّط ہوں گے۔ایسے میں کائنات کی تخلیق ہوئی اور لفظ ''کُن'' کی ادائی کے ساتھ ہی کائنات بکھر گئی۔ گویا سناٹوں نے فردا کی تخلیق کی اور زندگی اپنے جلو میں ہنگامے لیے چلی آئی۔انسان کی تخلیق ہوئی اور ایک ہنگامے نے جنم لیا۔ میں سوچنے لگی! اسی طرح جب کائنات کی انتہا ہوئی تو مہیب سناٹے ہوں گے، اور حسن وانصاف کی گھڑی طلوع ہوگی۔ یہ سناٹے ہی تو ہیں جو ابتدا اور انتہا کی خبر لانے والے ہیں۔

اس بات میں کتنی صداقت ہے کہ سناٹے انسان کو زندگی کے خزانوں کی طرف لے جاتے ہیں۔ وہ انمول خزانے اُن لوگوں کا مقدر ہیں جو دنیاداری چھوڑ کر غاروں اور صحراؤں میں سناٹوں کو سنتے ہیں، غیبی آوازوں سے ہم کلامی کا شرف حاصل کرتے ہیں، بڑے بڑے فلسفیوں، پیغمبروں اور اولیائے کرام کے درجوں پر فائز ہوتے ہیں جن سے بھٹکی ہوئی انسانیت فلاح پاتی ہے۔ یہ سناٹے ہی تو ہیں جو انسان کو تنہائی کی کوکھ سے رازہائے کائنات سمجھا جاتے ہیں۔

رات چوں کہ بہت گہری تھی، اس لیے خاموشی اور چُپ چاپ چلتی ہوائیں، اور زیادہ گونج دار محسوس ہوئیں۔ بولتے سناٹے میرے کان میں کچھ کہہ رہے تھے اور میں برابر اُن سے ہم کلام تھی۔ ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے میں اُڑتے پرندوں کے ہمراہ بلندیوں پر محوِ پرواز ہوں۔ بادلوں کے سنگ..... چاند تاروں کے ساتھ، یہ سفر بڑا خوش کن لگا...... بلندی پر پہنچ کر خاموشی دو چند ہوگئی اور اس خاموش فضا کی کوکھ سے جنم لیتے سناٹوں نے زندگی کی حقیقتوں سے روشناس کرادیا۔۔۔!

ان سناٹوں نے میری روح کو زندگی کی بقا کا راز باآسانی بتادیا۔ بولتے سناٹوں کی یہ آوازیں اپنے ہمراہ، رازہائے زیست کے بہت سے اور پہلو لیے چلے آئی، اور میں کائنات کے حسن پر غور کرنے

لگی۔ بلند و بالا درختوں سے کائنات کا حسن وابستہ ہے۔ درخت، جس کے گھنے سائے تلے گوتم نے گیان حاصل کیا اور نورِ حق پایا۔

سوچنے لگی، اگر یہ درخت نہ ہوں تو کائنات کتنی ویران لگے! بلند و بالا درخت۔۔۔۔ایک خودسپردگی کے عالم میں ڈوبے، تدبر اور تفکر سے انسان کو دوچار کر جاتے ہیں۔ سناٹوں کی آواز میری روح میں اُتر گئی جو اُن درختوں کے پتوں کے باہمی ٹکراؤ سے پیدا ہونے والی آوازوں کو سن رہی تھی۔ اُس کیف آور، خوش کن آوازوں کو انسان کا تخیل گیتوں کی شکل میں ڈھالتا ہے۔ یہ میٹھے اور درد بھرے گیت اُن بولتے سناٹوں کے مرہونِ منت ہیں جو انسانی روح کی غذا بنتے ہیں۔

ایسے میں مجھے گاؤں کا وہ دُور اُفتادہ اسٹیشن دکھائی دینے لگا۔۔۔۔ گاڑی آنے سے پیشتر۔۔۔۔خاموش فضا۔۔۔۔نہ ختم ہونے والے سناٹے اسٹیشن کو گھیرے میں لیے ہوتے ہیں۔ اگر موسم سرما کا ہو اور دھند بھی ہو تو یہ خاموشی اور سناٹے اور بھی واضح ہو جاتے ہیں۔ سیٹی کی آواز، سب سے پہلے اس خاموشی کو توڑتی ہے اور پھر ان سناٹوں میں خوانچہ والوں کی آوازیں۔۔۔۔ چائے گرم کے الفاظ۔۔۔۔ بچوں کی چہکار کتنی بھلی لگتی ہے! یہ آوازیں میرے دل میں اُتر گئیں جو گویا تھیں۔۔۔۔ کہ زندگی کی خوبصورتی شور و شغب میں ہے، حرکت میں ہے، ان بچوں کی معصوم آوازوں میں ہے۔ میرا جی چاہنے لگا کہ میں اُن آوازوں کے ہجوم میں گم ہو جاؤں اور کہیں دُور چلی جاؤں، جہاں میری روح زندگی کی اصل حقیقتوں کو اپنی کھلی آنکھوں سے دیکھ کر سیراب ہو جائے!

سناٹوں کی آواز وہی سمجھ پاتا ہے جو تنہائی کا دلدادہ ہو۔۔۔ تنہائی بھی وہ جو تاریکی میں دبے پاؤں آتی ہے۔ ایسی تنہائی میں بسا اوقات، میں ماضی کے دھندلکوں میں بھٹکنے لگتی ہوں۔ بہت سی ہستیاں میرے ذہن میں اُتر آتی ہیں۔ یہ خاموش اور بولتے سناٹے اُن ہستیوں کے ہمراہ مجھے محبتوں اور نفرتوں کی پہچان کروا جاتے ہیں۔

ایسی طویل اور نہ ختم ہونے والی خاموشی میں، میں نے خود کو لق و دق صحرا میں پایا۔۔۔ شاید آپ نے بھی میری طرح ایسا ہی محسوس کیا ہو۔ اس طویل خاموشی کے طلسم کو توڑنے کے لیے، میں نے با آوازِ بلند۔۔۔۔ زور سے پکار کر دیکھا اور یہ آواز سناٹوں کی گونج کے ساتھ مل کر پلٹ کر خود میرے پاس آ گئی۔ کچھ دیر تو میں حیران سی رہی، پھر جب اس آواز نے مجھے اپنے ہونے کا احساس دلایا تو میرے جی نے بار بار اُس خاموشی کے گنبد کو توڑنا چاہا، اور بار بار اپنی ہستی کو پہچان کر میں مسرور ہوتی رہی۔۔۔۔!

میری ہستی میرا یہ جسم۔۔۔اس میں بھی تو بہت سے سناٹے جمع ہیں۔ان سناٹوں کی طویل رفاقت مجھے بہت عزیز ہے۔میری ہستی میں بستے سناٹوں کی لَے' اُس ہستی کے ہاتھ میں تھی جو مجھے بہت عزیز تھی۔اُس نے میری رُوح کو جھنجھوڑ ڈالا اور میری ہستی میں سوئے خواب ایک گونج دار آواز کے ساتھ بیدار ہو گئے۔ مجھے جینے کا قرینہ آ گیا۔ایسی کیفیت میں میری رُوح یہی چاہتی رہی کہ میں کسی پہاڑی مقام کی خاموش فضاؤں میں چلی جاؤں جہاں میرے سوا کوئی نہ ہو۔۔۔۔زمین پر مخملیں بچھونا ہو اور میں دُنیا و مافی ہا سے بے خبر۔۔۔گھاس پر لیٹ کر جھکے آسمان کو دیکھوں۔۔۔۔سرسراتی ہوائیں' وادی میں گونجتے سناٹے' میری رُوح میں اُتر جائیں۔۔فکرِ فردا دامن گیر ہو نہ ماضی کی تلخ یادیں۔۔۔بس میرا حال ہو جو مجھے اُمیدوں کے دیپ جلانا اور محبتوں کے گیت الاپنا سکھا جائے!

سناٹوں کی آواز کو میں نے خاص طور پر شہر خاموشاں میں پایا ہے جہاں کی غیر معمولی خاموشی اور سحر زدہ ماحول' ایسے سناٹوں کو جنم دیتا ہے جنھیں صرف دِل کی دھڑکنوں میں محسوس کیا جا سکتا ہے۔یہ سناٹے اپنے پیاروں سے ہم کلام کرواتے ہیں جو مٹی کی چادریں اوڑھے سو رہے ہوتے ہیں۔یہ سناٹے ازل و ابد کے بھید' حیات و ممات کی کشمکش اور جہد وعمل کا پیغام اُڑتی ہواؤں کے سنگ آپ کو دے جاتے ہیں۔اس دوران میں میں آپ زندگی کی اصل حقیقتوں کو پہچان جاتے ہیں۔گزرتے لمحوں میں زندگی کی قدر و قیمت جان کر اس سے پیار کرنا سیکھ جاتے ہیں۔قبرستان میں گزرتے لمحے اور زندگی کے تمام رنگ اپنی رعنائی اور بدہیئتی کے ہمراہ بولتے سناٹوں کے سنگ' میرے تن بدن میں اُتر آئے اور جسم میں ایک جھرجھری سی آ گئی۔میری رُوح جو محوِ پرواز تھی' آسمان کی رفعتوں سے زمین پر اُتر آئی۔میری روح اُن بولتے سناٹوں سے ہم کلام تھی۔میں رات کے پچھلے پہر کی اس طویل خاموشی سے خوفزدہ نہیں تھی بلکہ میری رُوح ایک وِجدانی کیف سے دوچار تھی جو اِس بات کی غمازی کر رہی تھی کہ میں کائنات کا حصہ ہوں!

یہ کائنات جو ازل سے ابد تک کے لیے ہے' اس میں میرا وجود محض ایک جھونکا سہی مگر اولادِ آدم ہونے کے ناتے' مجھے ازل و ابد کے دَھاروں میں سنا تو جا سکتا ہے۔۔۔!

☆☆☆☆

ڈاکٹر منور عثمانی

دُھند میں سفر شروع ہُوا

دُھند میں سفر شروع ہوا اور پھر دُھند اور سفر آپس میں خلط ملط ہو گئے۔۔۔ پتا ہی نہیں چل رہا تھا کہ دُھند آگے بڑھ رہی ہے یا سفر! خیر' ذرا آگے چل کر' جب دُھند اور سفر کو دھوپ ملی تو دونوں نے ایک دوسرے سے جُدا ہونے کا فیصلہ کیا۔ دُھوپ خوش گوار اور مسافر نواز تھی۔ ہم دُھوپ کو دیکھ رہے تھے اور دُھوپ کی نظر ہمارے سفر پر تھی' اور جب احاطۂ سفر اور عرصۂ تمازت بڑھ چلا تو ''شہرِ بھُونگ'' کا دَر کھُلا۔۔۔ ایک غیر طلسماتی' قصباتی' تخلیقی' خاموش اور اپنے آپ میں مگن شہر گویا عجیب شہر! ابھی ہم نے اس شہر کو دیکھا نہ اس کی خاموشی کو سُنا کہ اس کی زمین کو آسمان بنانے والی مسجد ہمارے رُوبرو آ گئی یا ہم اس کے رُوبرو آ گئے۔ اَب ہم شہرِ طلسمات میں تھے لیکن روشن' واضح اور بیدار تھے گویا اس نے ہمیں معدُوم کیا نہ مدھم نہ مدہوش' بس ہمیں چُپ سی لگ گئی تھی۔۔۔ ایسی چُپ کہ ہم مسجد کی تعریف اور بانیِ مسجد کی تحسین میں تقریر تو کُجا' کسی سرگوشی کے بھی خطاوار نہ ہو سکے' گویا ہم سب ''بھُونگ'' میں بدل گئے۔۔۔ اب معلوم ہوا کہ بھُونگ' ایسا خاموش کیوں ہے (شاید اس مسجد میں تقریریں بھی ہوتی ہوں لیکن اس کی نزاکت' اُن کی صلابت کو کیسے برداشت کرتی ہوگی!)

دنیا کی ہر عظیم عمارت کے عقب میں کوئی نہ کوئی وقوعہ' وعدہ' معاشقہ' دبدبہ' تنازع یا المیہ' اپنے تناظر کی تمام لہروں کے ساتھ پھیلا ہوتا ہے اور عمارت کی خودمختاری کو چیلنج کرتا رہتا ہے حتیٰ کہ عمارت ختم ہو جاتی ہے' تناظر پھیلا رہتا ہے۔ بھُونگ مسجد کے عقب میں فقط تخلیقی اُمنگ ہے' سو اِس کی جمالیاتی خود کفالت پر کوئی سایہ نہیں جو اِسے ڈھانپے یا اس سے آگے قدم بڑھائے۔ تخلیقی اُمنگ قائم رہتی ہے اور قائم رکھتی ہے۔

مسجد سے باہر بھُونگ میں ایک روایت مشہور ہے کہ کسی نے بانیِ مسجد کو خواب میں بتایا تھا: ''جب تک مسجد کی تعمیر جاری رہے گی' تم زِندہ رہو گے!'' بانیِ مسجد وفات پا چکے ہیں اور مسجد کی تعمیر جاری ہے۔ شاید یہ روایت صحیح اور وہ خواب سچا ہو' بس الفاظ یہ ہوں: مسجد اپنی تعمیر جاری رکھے گی تاکہ تم زندہ

رہو!'' واقعی مسجد' اپنی تعمیر خود جاری رکھے ہوئے ہے۔۔۔ تکمیل پانے کے لیے نہیں، تخلیق ہوتے چلے جانے کے لیے تاکہ اپنے امکانات کو جانے' جتنا بھی جان سکے کہ اِمکانات کو جاننا ہی ''علم'' ہے۔

بھُونگ مسجد' ایک نامیاتی وجود ہے۔ یہ مسجد کسی نقشے، منصوبے' اِرادے' فیصلے (حتیٰ کہ چندے) کے بغیر بنی اور بنتی چلی گئی اور آج بھی بن رہی ہے۔ یہ دُنیا کی زندہ تخلیقی عمارت ہے۔ اس میں جاہ ہے نہ جلال' فقط جمال ہے۔ یہ اپنے اندر سے پھُوٹ رہی ہے' باہر کے ذرائع تو فقط اِس کی لطافت اُبھارنے کے لیے بخوشی اپنے آپ کو صرف کر رہے ہیں۔

دُنیا کی ہر قابلِ ذکر عمارت نے پہلے پہل کسی کے تخیل میں آنکھ کھولی تھی (تخیل کسی کے نقشے' نقشہ کسی کے اِرادے اور اِرادہ کسی کے فیصلے میں مرتب اور محکم ہوا تھا)۔ بھُونگ مسجد کا معاملہ یُوں نہیں' یہ اپنے ہی تخیل میں جاگی' اپنے ہی اِرادے میں مرتب اور اپنے ہی فیصلے سے ظاہر ہوئی' نیز تا حال آمادۂ اِظہار ہے؛ اِسی لیے اِس کی نمود اعلان نہیں فقط اِنکشاف ہے کہ ''میں ہوں'' اور میں اِس لیے ہوں کہ میں حالتِ تخلیق میں ہوں''۔

بھُونگ مسجد ایک متعیّن منظر نہیں کہ تعیّن، تحیّر کو مٹا دیتا ہے۔ یہ منظر ایک سچے ناظر کے لیے ہر بار نیا سا ہو جاتا ہے؛ اور تو اور اِسے دُور بیٹھ کر یاد کیجیے تو تصوّر میں ہر دفعہ ایک نئی بھُونگ مسجد جاگتی ہے۔ اس کے برعکس، کسی اور عمارت مثلاً تاج محل کو ذہن میں لائیں تو فقط ایک ہی صورت، ایک ہی ساخت' ٹھک سے خیال میں آتی ہے۔ تاج محل کے حوالے سے تو یہ احساس ہوتا ہے کہ اَزل سے ایسا ہے اور اَبد تک ایسا رہے گا اور لگتا ہے کہ بننے کے عمل ہی سے نہیں گزرا' بنا بنایا' تَرشا تَرشایا منصۂ شہود پر آیا ہے۔

بھُونگ مسجد' کہیں سے بھی حتمی اور قطعی نہیں کیوں کہ یہ ساخت پرست نہیں' ساخت شکن ہے۔ بننے اور بدلنے کے عمل نے اِس کے بطن اور متن کو ایک تخلیقی بہاؤ عطا کر رکھا ہے' لہٰذا جب بھی اسے دیکھیں یا پڑھیں' ایک نیا مطلعِ انوار سامنے آ جاتا ہے۔ ہاں! ایک بات عجیب ہے کہ ناظر اپنی نظارت اور قاری اپنی قرأت میں پختہ نہ ہو تو اس مسجد کا متن' سادہ کاغذ میں بدل جاتا ہے گو اُس سادہ کاغذ کو دیکھ لینا بھی سعادت ہے کہ جب بھی ناظر کی نظر اور قاری کی قرأت روشن ہوتی ہے' اُس کے حافظے میں موجود اُس سادہ کاغذ سے عبارت و اشارت اور منظر و معنی کے کئی جہان پھُوٹ پڑتے ہیں۔

ٹھوس اور ناقابلِ تغیّر نظر آنے والا فن پارہ یا خیال پارہ راستہ نہیں دیتا' وہ اتنا بلند' بھاری اور پھیلا ہُوا پہاڑ بن جاتا ہے کہ اُس کے سوا کسی کو کچھ نظر نہیں آتا: عام مسافر تو اُس پہاڑ کے پاس پہنچ کر خوش

اور شانت ہو جاتے ہیں لیکن کئی ایک ایسے بھی ہوتے ہیں جنھیں اُس سے آگے جانا ہوتا ہے؛ وہ اُس پہاڑ سے ٹکراؤ چاہتے ہیں نہ اُس کے پاس پڑاؤ چاہتے ہیں۔ اِس کے برعکس؛ ایک فن پارہ وُہ ہوتا ہے جو روشنی میں بدل جاتا ہے اور روشنی راستہ روکتی نہیں؛ راستہ دِکھاتی ہے۔۔۔یہی وہ مقام ہے جہاں حُسن پارے یا فن پارے کے لیے یہ الفاظ: واہ واہ، کیا بات ہے؛ بہت لطف آیا۔۔۔حاصلِ کلام؛ کمالِ فن؛ عجوبۂ روزگار وغیرہ؛ بہت ہی مخدوش اور مجہول سے نظر آتے ہیں (اور بعض اَوقات اُنھیں دُہرانے والے بھی)!

بھُونگ مسجد میں جا کر اُنھیں شاید لطف نہ آئے جو ہر تعمیر اور تخلیق کو نقشوں؛ ضابطوں اور ہیئتوں کا اَسیر دیکھنا پسند کرتے ہوں اور خود اپنی ذات میں بھی بے حد منصوبہ بند؛ اٹل اور ان مِٹ ہوں۔ بھُونگ مسجد کی جمالیات اور شعریات ریزہ ریزہ پُرزہ پُرزہ؛ لخت لخت لوگوں پر زیادہ کھلتی ہیں۔۔۔میں بھی ایک ایسا ہی شخص ہُوں۔

بھُونگ مسجد سے میرا رشتہ بہت پُرانا ہے۔ اَب میں اس سے ایک طویل مدت بلکہ فرقت کے بعد ملا تو اس نے پوچھا کہ کہاں رہے۔۔۔اَب میں کیا بتاتا کہ کہاں رہا!

بھُونگ سے میرا وُجود تو دور رہا لیکن میرے خواب اِس کے مُضافات ہی میں بستے رہے۔ میرے ہر خواب میں ایک سفر جاگتا تھا اور پھر بھُونگ آ جاتا تھا۔ شاید اِس کی وجہ یہ تھی کہ بھُونگ مسجد؛ پہلی حسین عمارت تھی جو میری بصارت اور باطن کا حصّہ بنی اور پہلی محبت کسے بھولتی ہے!

زمانۂ فرقت میں اور بھی حُسن پارے؛ فن پارے نظر اور دِل کے رفیق بنے؛ اِسی زمانے میں مجھ پر منکشف ہوا کہ کچھ فن پارے ایسے ہوتے ہیں جنھیں ہم اپنے آپ میں ضم کر لیتے ہیں اور کچھ ایسے جو ہمیں اپنے آپ میں ضم کر لیتے ہیں۔ بھُونگ مسجد میں یہ دونوں خصوصیات ہیں۔

آج میں بھُونگ مسجد کے رُوبرو ہوں تو عجب دو طرفہ بلکہ سہ طرفہ عمل بپا ہے۔ اِس عمارت کے سارے جُزو میری ذات میں جذب ہو رہے ہیں اور میرے اندر کی دُور اُفتادہ گوشہ نشیں لہروں سے گھُلتے ملتے بہت دُور تک چلے گئے ہیں۔ دوسری جانب خود میرا کرچی کرچی؛ پرچی پرچی اور دھجی دھجی وجود اِس مسجد کی دہلیزوں؛ دیواروں؛ محرابوں اور اِس کے زینوں؛ گنبدوں؛ میناروں میں نہایت عجز کے ساتھ ضم ہو رہا ہے۔ میں مرتب صورت میں تو پہلے بھی کہیں نہیں تھا اور ترتیب کی کوئی صورت تو شاید اَب بھی نہ نکلے لیکن ایک اور صورت نکل آئی ہے۔۔۔میرے وجود کی سب کرچیاں؛ پرچیاں؛ دھجیاں، گو میرے متن کے سب اقتباسات اَب پڑھے جا رہے ہیں؛ پہلے بھی ان کے کچھ حرف خواندگی میں آ جاتے

تھے لیکن کسی کی عبارت گنجلک تھی، کسی کا اِملا نا قابلِ شناخت تھا، کسی کا بین السطور روشن نہیں تھا، کہیں متشابہات تھے، کہیں مقدرات تھے، کہیں سے درمیانی کڑیاں غائب تھیں، کہیں شانِ نزول واضح نہ تھی: لیکن اَب کتنی روانی اور فراوانی سے قرأت جاری ہے۔۔۔۔ میں خود کو پڑھ رہا ہُوں یا خود مجھے پڑھ رہا ہے۔۔لیکن یہ کیا۔۔۔ بات یہاں پر رُکنے کے بجائے آگے بڑھ رہی ہے اور میرے اِقتباسات مسجد کے متن سے آمیز ہونے لگے ہیں: یُوں نئی عبارت، نئی اِشارت پھُوٹنے لگی ہے' ہر سطر پر کئی کئی سطروں کے حاشیے ظاہر ہو رہے ہیں' فراموش حوالے جل بُجھ رہے ہیں' بین السطور سے پَرے معدُوم نسخوں کی منہدم عبارتیں' اپنی تعبیرِ نَو کی خود ترتیل کیے رہی ہیں۔۔۔ گویا پڑھنے' دیکھنے اور سننے کا کام بہت بڑھ گیا ہے اور وقت کم ہے۔۔۔۔ واپسی راہ دیکھ رہی ہے، سفر جاگنے کو ہے سو کیا پڑھیں اور کیا چھوڑیں۔۔۔۔ لیجیے، اس عرصۂ محشر میں ایک اور منظر اُبھرنے لگا ہے کہ وہ جو دونوں آمیز ہو کر، نئی عبارتیں اور ناپید روایتیں سامنے لا رہے تھے، اب ایک دوسرے سے ایک ازلی وابدی مکالمہ شروع کر بیٹھے ہیں اور ایک دوسرے کی ان کہی کو ایک دوسرے سے کہہ رہے ہیں، اور اب۔۔۔۔ اب لگتا ہے کہ بات مکالمے سے بھی آگے بڑھ گئی ہے، دونوں اپنے اپنے "ہونے" کے احاطے سے نکل کر "ان ہونی" کو تخلیق کر رہے ہیں۔ غالبًا "ان ہونی" نے متون کھُلنے، دائرے ٹُوٹنے اور قرأتوں کے آمیز ہونے پر آنکھیں کھولی تھیں اور مکالمے سے بعد آگے بڑھ جانے پر ظہور چاہا ہے۔ مختصر یہ کہ تخلیق کی قرأت بھی آمادۂ تخلیق ہے۔

اور اُدھر واپسی راہ دیکھ رہی ہے، دھوپ جانے اور دُھند بڑھنے لگی ہے، اور اب پھر۔۔۔۔ دُھند میں سفر شروع ہوا ہے، دُھند اور سفر آپس میں خلط ملط ہو گئے ہیں اور شہرِ طلسمات آنکھوں سے اوجھل ہو گیا ہے لیکن وہ قرأتیں جو اس سفر کا حاصل ہیں' اپنے اظہار کے لیے راستہ مانگ رہی ہے۔۔۔۔ایک نیا راستہ!!

شفیع ہمدم

برگد

گرمیوں کی ایک تپتی دوپہر میں مجھے ایک گاؤں کے برگد تلے چند گھنٹے گزارنے کا اتفاق ہوا۔ مجھے لگا کہ میں صحرا سے پیدل چل کر ایک ٹھنڈے مہربان سائے میں ہی نہیں آ گیا بلکہ ایک نئی اور حیرت افزا دنیا میں پہنچ گیا ہوں۔ میرے تھکے ہوئے اعصاب میں انوکھی توانائی کی لہر دوڑنے لگی اور میرا دل شاداب ہونے لگا۔ شہر کی آلودہ، مصروف اور پیچیدہ زندگی میں آدمی کی روح پر جو زخم لگتے ہیں وہ اس برگد کی چھاؤں میں تیزی سے مندمل ہونے لگے۔ مجھے اپنا آپ اور اپنے سامنے سب کچھ خوبصورت لگنے لگا اور جو ادجھل تھا وہ رنگین دکھائی دینے لگا۔

برگد نے زمین کے خاصے بڑے حصے کو اپنے حصار میں لے رکھا تھا اور اس سارے حصے کو گاؤں کے تقریباً سبھی عمر اور قماش کے لوگوں نے اپنے تصرف میں لیا ہوا تھا۔ مجھے لگا کہ دیہات میں برگد کی حیثیت ایک کلب کی سی ہے۔ لوگ گھروں کی محدود فضا سے نکل کر اس کلب میں آ جاتے ہیں۔ تاش کھیلتے، گپیں لگاتے، ریڈیو سنتے، آرام کرتے اور ماہیے ٹپے گاتے ہیں اور جب ان اشغال سے بور ہونے لگتے ہیں تو کلائی پنجہ کے مقابلے کی تیاریاں شروع کر دیتے ہیں۔ اس مقابلے میں دونوں ٹولیاں اپنے اپنے شہ زوروں کے حوصلے بڑھانے کے لیے خوب نعرہ زنی کرتیں ہیں۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ کلائی پنجے کا مقابلہ دو کھلاڑیوں کے درمیان نہیں بلکہ دو قبیلوں کے درمیان ہے۔ ہر مقابلے میں خواہ وہ چھوٹا ہو یا بڑا، آدمی کی قبائلی عصبیت' دوسرے کو نیچا دکھانے کی اجتماعی سرشت کا اظہار ضرور ہوتا ہے۔ گاؤں کے کلچر اور گاؤں والوں کی نفسیات کی نفسیات کا پتا اس ''کلب'' سے با آسانی لگایا جا سکتا ہے۔ برگد بجا طور پر گاؤں کا ایک ثقافتی مرکز ہے۔

برگد نے اپنی نعمتوں کو صرف انسانوں کے لیے ہی مخصوص نہیں کیا ہوا تھا' بلکہ پرندوں کے لیے بھی اس نے اپنا دامن کشادہ کر رکھا تھا۔ انسان پیڑ کے نیچے مختلف مشاغل سے اپنا جی بہلا رہے تھے تو پرندے بے خودی کے عالم میں چہچہاتے ہوئے شاخوں پر ادھر اُدھر پھدک رہے تھے۔ شاید وہ تپتی ہوئی دھوپ سے پناہ دینے پر برگد کی مدح میں گیت گا رہے تھے۔ پرندوں اور انسانوں کی آوازوں سے فضا

میں ایک انوکھا غنائی ارتعاش تھا جس کی تفہیم نہ ہونے کے باوجود میرے دل میں گداز پیدا ہو رہا تھا۔

برگد کے پتوں نے صف میں کھڑے نمازیوں کی طرح کندھے سے کندھا ملایا ہوا تھا۔ سورج کی کرنیں ان میں چھید ڈال کر نیچے جھانکنے کی کوشش میں مصروف تھیں مگر پتوں کا باہمی اتحاد کرنوں کی ہر جسارت کو ناکام بنا دیتا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ گرمی کی شدت اور سورج کی تپش کے باوجود برگد کی گھنی چھاؤں ایک انوکھی راحت افزا خنکی کا موجب تھی۔ اس لمحے مجھے برگد پر ایسے مضبوط قلعے کا گمان ہوا جس کی دیواروں سے سورج کی توپ سے نکلنے والے آتشیں گولے اپنا سر پھوڑ رہے تھے اور وہ اپنے لبوں پر طنزیہ مسکراہٹ سجائے ان کا مضحکہ اُڑا رہا تھا۔ سورج کی شعاعوں اور برگد کے پتوں کے درمیان برپا ہونے والی جنگ کا میں تادیر نظارہ کرتا رہا اور سوچتا رہا کہ خیر و شر کی جنگ ہر جگہ اور شاید ہر وقت برپا ہے۔

اکثر درخت ہوا کی سرگوشی سے ہی سر دھننے لگتے ہیں۔ تیز ہوا میں تو وہ باقاعدہ دھمال ڈالنا شروع کر دیتے ہیں اور بعض اوقات دھمال ڈالتے ڈالتے بے خودی کے عالم میں جا پہنچتے اور اچانک گر پڑتے ہیں مگر برگد ہوا کے مختلف النوع اطوار سے کوئی خاص اثر قبول نہیں کرتا۔ برگد نہ ہوا کے نرم جھونکے سے کوئی فریب کھاتا ہے نہ ہوا کے کسی تند تھپیڑے سے اس پر لرزہ طاری ہوتا ہے۔ کچھ لوگ بھی مصائب کے معمولی جھونکے سے ٹوٹ جاتے ہیں مگر بعض لوگ اندر سے اتنے مضبوط ہوتے ہیں کہ آلام و ادبار کے طوفانوں میں بھی برگد کی طرح دھرتی پر پاؤں جمائے کھڑے رہتے ہیں۔

میں سوچا کرتا تھا کہ رشی منی عرفان حاصل کرنے کے لیے اکثر برگد کے نیچے ہی کیوں مراقبہ کرتے ہیں؟ کوئی اور جگہ اور کوئی اور درخت کیوں نہیں؟ جس گرہ کو میں عرصہ سے کھولنے میں مصروف تھا آج برگد کی قربت میں وہ گرہ رفتہ رفتہ کھل رہی تھی۔ پہلے میرا خیال تھا کہ رشی منی دنیا کے ہنگاموں سے گھبرا کر برگد کے نیچے خاموشی اور اطمینان کے حصول کی خاطر آتے ہیں مگر آج مجھ پر کھلا کہ وہ اپنے اندر برگد کے اوصاف پیدا کرنے کے لیے برگد کے نیچے آتے ہیں۔ وہ خود کو تیاگ کر برگد میں منقلب ہونے کی ریاضت کرتے ہیں۔ جب ان کی شخصیت میں برگد کی کشادگی، استقامت اور سخاوت پیدا ہو جاتی ہے اور ان کی روح دنیاوی آلائشوں سے پاک ہو جاتی ہے تو وہ لوگ برگد کی طرح سود و زیاں سے ماورا ہو کر خود کو مخلوقِ خدا کے لیے وقف کر دیتے ہیں۔

برگد کا پودا اتنی سست رفتاری سے پروان چڑھتا ہے کہ اس کے ہم عمر درخت بچپن، لڑکپن اور جوانی کے ادوار گزار کر بڑھاپے کی سرحد میں قدم رکھ دیتے ہیں اور کئی تو آنجہانی بھی ہو جاتے ہیں مگر

برگد ہنوز نشوونما کے مدارج طے کر رہا ہوتا ہے۔ سفیدا اتنی تیزی سے بڑھتا ہے کہ قلیل عرصے میں آسمان سے باتیں کرنے لگتا ہے مگر بودا اتنا ہوتا ہے کہ طوفان کا ایک طمانچہ برداشت نہیں کر پاتا اور زمین بوس ہو جاتا ہے۔ بعض اوقات تو اپنے اندر کی ناطاقتی کے ہاتھوں اچانک ٹوٹ بھی جاتا ہے۔ شاید اسی لیے کہ جو چیز آسمان کو اپنی منزل بناتی ہے۔ زمین سے اس کا رشتہ کمزور ہو جاتا ہے۔ برگد نامحسوس طریقے سے زمین کے دور دراز گوشوں میں اپنی جڑیں اتارتا چلا جاتا اور اتنا توانا ہو جاتا ہے کہ مہیب طوفان بھی اس کو خمیدہ نہیں کر سکتے۔ وہ بادِ تند کی مجنونانہ حرکات پر ایک بزرگ کی طرح کھڑا مسکراتا رہتا ہے۔

دوسرے درختوں کا آندھی اور طوفان سے گرنا۔ لوبھ اور موہ کے کلہاڑے سے کٹنا روز مرہ کا معمول ہے۔ ان کے کٹنے پر مجید امجد ایسا حساس شاعر تو تڑپ اُٹھتا ہے اور ان کے بارے میں ایک نوحہ تخلیق کر دیتا ہے۔ ورنہ عام لوگوں کی نظر میں ان کی کوئی اہمیت نہیں ہوتی۔ برگد ایک ایسا مقدس اور مستحکم پیڑ ہے جسے بہت کم کٹتے دیکھا گیا ہے۔ اگر کسی ناگزیر وجہ سے اسے کاٹنا ضروری ہو جائے تو اس کا کٹنا بہت بڑا سانحہ ہوتا ہے۔

اکثر فن کار سفیدے کی طرح نہایت قلیل عرصہ میں شہرت کی بلندیوں کو چھونے لگتے ہیں مگر وقت کا ایک ہی تھپیڑا انھیں خاک چاٹنے پر مجبور کر دیتا ہے۔ وہ ''ہوائی'' کی طرح جتنی تیزی سے بلندی کی طرف جاتے ہیں اتنی ہی عجلت میں پستی کی طرف آتے اور گمنامی کے پاتال میں اُتر جاتے ہیں۔ ان کے برعکس ایک حقیقی فن کار ستائش اور صلے سے بے نیاز ہو کر نہایت سست روی سے تخلیقی عمل جاری رکھتا ہے۔ اس کے استقلال اور ریاضت کی وجہ سے اس کی شخصیت اور تخلیق میں برگد کا سارا استحکام اور کشادگی پیدا ہو جاتی ہے۔ وہ آنے والے زمانوں کو اپنے سائے اور پناہ سے نوازتا ہے۔

آکاس بیل اپنی عشوہ طرازی اور لاگ لپٹ سے بھولے بھالے درختوں کو اپنے دامِ تزویر میں گرفتار کر لیتی ہے۔ آکاس بیل کا عشق درخت کو مجنوں کی طرح لاغر کر دیتا ہے مگر خود ہری بھری رہتی ہے۔ وہ بڑے ٹھسے سے درختوں کے کندھوں پر سواری کرتی ہے۔ پلک جھپکنے میں ایک درخت کے پہلو سے نکل کر دوسرے درخت کے شانوں پر سوار ہو جاتی ہے مگر پہلے پیڑ سے بھی تعلق برقرار رکھتی ہے۔ آکاس بیل تقریباً سب درختوں پر شب خون مارتی ہے مگر برگد کی قلم رو میں داخل ہونے اور اس کی شاخوں میں پنجے گاڑنے کا اپنے اندر حوصلہ نہیں پاتی۔ میرے خیال میں یہ برگد کا جاہ و جلال، بزرگانہ وقار اور استقامت ہے جو آکاس بیل ایسی خود غرض مخلوق کو اس سے دور رہنے پر مجبور کرتی ہے۔

مشتاق احمد

لامکانی، لازمانی

کیا ہی اچھا زمانہ تھا جب زمین ساکن تھی، سورج، چاند، ستارے اور سیارے سبھی اجرامِ فلکی ساتوں آسمانوں کے گرد گھوما کرتے تھے۔ کہتے ہیں اُس وقت زمین گائے کے سینگ پر یا کسی کچھوے کے پیٹھ پر ٹکی ہوئی تھی۔ یہ تو معلوم نہیں کہ وہ گائے یا کچھوا کس چیز پر کھڑا تھا، بہرحال زمین اُن میں سے کسی ایک پر ٹکی ہوئی تھی اور بالکل ساکت وصامت تھی۔ آج کل کی طرح وہ کئی گردشوں، اَن گنت حرکتوں اور بے شمار لرزشوں سے دوچار نہیں تھی۔ اس میں ہلکا سا ارتعاش صرف اس وقت پیدا ہوتا تھا جب گائے اپنا سینگ بدلتی تھی یا کچھوا لحظہ بھر کے لیے اپنی پیٹھ اِدھر اُدھر کھسکا تا تھا۔ اس وقت زمین کی بڑی شان تھی۔ وہ مرکزِ افلاک ہی نہیں، مرکزِ کائنات بھی تھی۔ میں جو اُس وقت بھی اِس کا باسی تھا بہت ہی خوش تھا۔ زمین کا باسی ہونے کی وجہ سے میں خود بھی مرکزِ کائنات تھا۔ میں ایک شہزادہ تھا، ایک مکرم اور مشرف شہزادہ۔ زمین میرا گھر تھی اور تمام درخشندہ ستارے عقیدت مندوں کی طرح میرے گھر کا طواف کیا کرتے تھے اور میرے لیے طرح طرح کی خدمات بجالایا کرتے تھے۔ سورج دن بھر میری زمین کو روشن رکھتا تھا، اُسے حرارت پہنچاتا تھا۔ وہ موسموں کے تغیر وتبدل کا فریضہ بھی انجام دیتا تھا اور بارشیں برسانے کا کام بھی اُسی کے سپرد تھا۔ وہ سمندروں، جھیلوں اور دریاؤں سے بھاپ کشید کرتا، ہوائیں انھیں بادلوں میں تبدیل کرتیں اور بادل برستے اور میری بنجر زمین کی گود طرح طرح کے پھلوں، پھولوں اور فصلوں سے بھر دیتے۔ ان پھلوں اور فصلوں کو اور پھولوں کو بھی خوبصورت رنگ عطا کرتا، انھیں چمکاتا اور طرح طرح کی شیرینیوں سے بھر دینا بھی سورج ہی کے ذمے تھا۔ سرد اور ٹھٹھرا دینے والے موسموں میں سورج ایک دہکتے ہوئے الاؤ کی طرح مجھے حرارت بخشتا تھا اور یخ بستگی سے بچاتا تھا۔ وہ یہ سب کام ایک ادنیٰ غلام کی طرح کرتا تھا۔ اُس وقت، میں کتنا عالی شان تھا!

جب سورج اپنے دن بھر کے کاموں سے فارغ اور تھکن سے چور ہو کر شام کو مغرب میں کسی جوہڑ یا کسی غار میں رات بھر آرام کرنے کے لیے چلا جاتا تو اُس کی جگہ چاند لے لیتا۔ چاند میرا بہت ہی

پیارا رفیق تھا۔ وہ اپنی ٹھنڈی اور ریشم سی ملائم کرنیں میری زمین اور میرے گھر پر نچھاور کرتا۔ اس کی رو پہلی چاندنی میری زمین کے میدانوں، جنگلوں، گلستانوں اور میرے گھر کے آنگن کو خوابگیں نور سے بھر دیتی اور ہر منظر کو رومانی بنا دیتی۔ میں سحر زدہ سا ہو کر اپنی بانسری اٹھاتا اور گھر سے نکل کر کسی ندی کے کنارے سبز گھاس پر بیٹھ جاتا اور بانسری کی تان ایک سرمدی نغمے کی طرح فضا میں پھیل جاتی۔ ندی کا پانی دھیرے دھیرے بہتا رہتا۔ چاند مسکراتے ہوئے مجھے تکتا اور میں از خود رفتگی کے عالم میں کھو جاتا۔ کتنے پُر کیف ہوتے تھے وہ لمحات! میں راتوں کو سفر کرتا تو چاند بھی میرے ساتھ گام گام چلتا۔ چاند نے مجھے دنوں اور مہینوں کا حساب رکھنا سکھایا۔ وہ شفیق اور مہربان ہی نہیں تھا، وقت کا پابند بھی تھا۔ وہ ہر مہینے کے بعد ایک چھٹی کرتا، اُس سیاہ رات کو میں نے اماوس کی رات کا نام دیا۔ اگلی رات چاند باریک اُدھوری سی قوس کی طرح دکھائی دیتا اور اگلی رات یہ قوس ذرا سا بڑھ جاتی اور روز بروز بڑھتی رہتی: یہاں تک کہ چاند پورا چاند یعنی ماہِ کامل بن جاتا اور پھر وہ گھٹنا شروع ہو جاتا اور پھر باریک قوس بن جاتا اور معدوم ہو جاتا۔ وہ بڑا منصف مزاج تھا۔ آدھا مہینہ میری زمین کے مشرقی نصف حصے کو روشنی سے نوازتا اور آدھا مہینہ مغربی نصف حصے کو۔ یہ چاند ہی تو تھا جس نے مجھے کیلنڈر عطا کیا۔ وہ میرے سمندروں میں مدوجزر پیدا کرتا اور مردوں اور عورتوں کے دلوں میں جذبات کے جوار بھاٹے اُبھارتا۔

چاند کی طرح ستارے بھی میرے ہمدم ودم ساز تھے۔ آسمان پر چاند نہ ہوتا یا پورا چاند نہ ہوتا تو یہ ستارے میرے بہت قریب آجاتے۔ وہ مجھ سے سرگوشیاں کرتے، معنی خیز اشارے کرتے، لوریاں سنا کر جن کی آواز میرا دل ہی سنتا تھا، مجھے سلاتے۔ وہ میرے رفیقِ سفر ہی نہیں ہوتے تھے، کسی مہرباں رہنما کی طرح رہنمائی بھی کرتے تھے۔ لق ودق صحراؤں، بے آب وگیاہ میدانوں اور گھنے جنگلوں میں وہی مجھے بتاتے تھے کہ مجھے کدھر کو جانا ہے اور میری منزل کس طرف ہے۔ وہ مجھے یہ بھی بتاتے تھے کہ رات کتنی گزر گئی ہے اور کتنی باقی ہے۔ طلوعِ سحر سے پہلے طلوعِ سحر کا مژدہ بھی ستارے ہی مجھے دیتے تھے۔ وہ میری تنہائی کے رفیق، سچے اور بے لوث غم گسار تھے اور میرا بہت خیال رکھتے تھے۔

میں اپنے اس حال میں بے حد خوش، مطمئن اور آسودہ خاطر تھا۔ کائنات کی ہر شے میرے آرام وآسائش اور راحت وسکون کے لیے سرگرمِ عمل تھی اور مجھے یقین تھا کہ یہ سب کچھ کائنات کی ہر شے میرے اور صرف میرے لیے بنائی گئی ہے۔ میری زمین جو میرا گھر تھا، مرکزِ کائنات تھی اور خود میں مقصد کائنات تھا۔

اِس خیال نے کہ میری زمین مرکزِ کائنات ہے اور میں خود مقصد کائنات ہوں' میرے اندر ایک عجیب قسم کا احساس برتری پیدا کر دیا تھا۔ میں اپنے آپ کو افضل ترین مخلوق بلکہ سید الموجودات سمجھنے لگا تھا۔ میں ایک مکمل ذات تھا' میری انا مضبوط تھی۔ شخصیت مستحکم اور خودی محکم۔ اس وقت میں اکیلا نہیں تھا' مجھے احساس تنہائی نہیں تھا۔ سورج' چاند' ستارے' پہاڑ' دریا' جنگل' درخت' پودے' پھول' پرندے اور طرح طرح کے جانور سب میرے ساتھی تھے۔ میں اُن سے باتیں کرتا تھا' وہ مجھ سے ہم کلام ہوتے تھے۔ وہ میرے دوست بھی تھے اور تابع فرمان بھی۔ وہ سب میری خدمت پر مامور تھے اور میرے لیے طرح طرح کی خدمات انجام دیتے تھے۔ میں خوش تھا' شاداں و فرحاں!

لیکن افسوس کہ وہ اچھا زمانہ زیادہ عرصہ قائم نہ رہا! حالات بدل گئے اور میں ایک مکرم اور معزز ہستی سے ایک مقہور فرو بن گیا جس کا اس لامحدود کائنات کے اندر کہیں کوئی مقام یا مستقر نہیں تھا۔ پھر یوں ہوا کہ میرے ابنائے جنس میں سے ہی کچھ ایسے افراد نمودار ہو گئے جنھوں نے یہ کہنا شروع کر دیا کہ زمین ساکن نہیں ہے وہ کچھ دوسرے سیاروں کے ساتھ سورج کے گرد گھوم رہی ہے۔ میں اور میرے بہت سے دوسرے ساتھیوں نے اس خلافِ عقل اور خلافِ مشاہدہ دعوے کو ماننے سے انکار کر دیا کیوں کہ اس دعوے کو ماننے کا مطلب یہ تھا کہ اب میری زمین نہیں' سورج مرکزِ کائنات ہے۔ آہستہ آہستہ سب لوگ اور دوسرے لوگوں کے ساتھ میں نے بھی اس نظریے کو تسلیم کر لیا مگر اسے تسلیم کرنے سے میرا احساسِ برتری کسی قدر مجروح ضرور ہوا۔

پھر وقت پہلے کی طرح گزرنے لگا۔ یہ نظریہ کہ زمین سورج کے گرد گھومتی ہے' ایک مسلمہ حقیقت بن گیا۔ حالات کے ساتھ سمجھوتا کرنا ہی پڑتا ہے۔ اس سمجھوتے کے لیے میرا یہ احساس خاصا مددگار ثابت ہوا کہ چلو میری زمین نہیں تو سورج تو ایک جگہ قائم اور برقرار ہے' وہ بھی تو آخر میرا ہی ہے! زمین نہ سہی سورج ہی سہی' میری کوئی چیز جس کا تعلق مجھ سے ہے' مرکزِ کائنات تو ہے۔ بلاواسطہ نہ سہی بالواسطہ میں اب بھی محترم ہوں۔ نظامِ شمسی کا ایک رکن ہونے کی حیثیت سے میری زمین سورج کے گرد گھومتی ہے تو پھر کیا ہے' سورج تو ساکن ہے! لیکن میری یہ خوش فہمی زیادہ دیر قائم نہ رہی۔ احساس برتری ایک بار پھر مجروح ہوا۔ کچھ اور سیانے لوگ کائنات کی تخلیق کے میدان میں وارد ہوئے اور انھوں نے کہا کہ سورج بھی ساکن نہیں' وہ اپنے پورے خاندان سمیت ایک بہت بڑی کہکشاں (ملکی وے) کا حصہ ہے اور اس کے ایک کنارے پر واقع ہونے کے ساتھ ساتھ نہایت تیز رفتاری کے ساتھ اپنے مدار میں

گھوم رہا ہے۔ اور صرف سورج ہی نہیں' اُس کہکشاں کے اندر کروڑوں ستارے جو سورج سے بھی بڑے ہیں اور جن کے درمیانی فاصلے کروڑوں نوری سالوں پر مشتمل ہیں' سورج ہی کی طرح ایک گردشِ مدام میں مصروف ہیں۔ میرا سورج تو کروڑوں ستاروں کے اس جمِ غفیر میں بہت ہی معمولی حیثیت کا مالک ہے۔ جب سورج کی یہ حیثیت ہے تو میری زمین کی اور اس ذرہ برابر زمین کے اوپر رہنے والے مجھ جیسے انسان کی حیثیت کیا ہو سکتی ہے! یہ نیا نظریہ تو مجھے ختم ہی کر گیا۔ میں تو کچھ بھی نہیں تھا' بس ایک ہستی موہوم! یہ نظریہ مجھے خوفزدہ کر گیا۔ مجھے کائنات سے خوف آنے لگا۔ میں آپ اپنی نظروں میں حقیر ہو کر رہ گیا۔ میری انا اب بُری طرح مجروح ہوئی اور میں دُکھی ہو گیا۔ اس کے باوجود میں نے اپنے آپ کو سنبھالا اور یہ کہہ کر دل کو تسلی دی کہ کوئی بات نہیں اگر میری زمین اور میرا سورج بھی ساکن نہیں تو وہ کہکشاں جس کے اندر میرا نظامِ شمسی موجود ہے اور اس کے گرد گردش کر رہا ہے' وہ تو ساکن ہے' وہ تو مرکزِ کائنات ہے' وہ تو میرے لیے جائے قرار اور میرا مقام ہے! لیکن میرا یہ تصور بھی زیادہ دیر برقرار نہ رہا۔ داناؤں نے اب بڑی طاقتور دوربین ایجاد کر لی تھی اور اس کی مدد سے وہ کھربوں نوری سالوں کے فاصلوں تک دیکھ سکتے تھے مجھے بتایا گیا کہ میری کہکشاں اس سے بھی بڑی بڑی کہکشاؤں کے ایک بڑے جھرمٹ کا محض ایک حصہ اور رکن ہے۔ کہکشاؤں کا یہ گچھا یا جھرمٹ خود بھی مسلسل گھوم رہا ہے اور اس کے ساتھ ہی اس میں شامل تمام کہکشائیں جن میں میری کہکشاں بھی شامل ہے بڑی تیزی کے ساتھ ایک مخصوص مدار میں محوِ گردش ہیں۔ داناؤں کے اس دعوے کا کوئی جواب یا تردید میرے بس کی بات نہیں تھی۔ میں یہ بات بھی مان گیا لیکن یہ مان لینے کے بعد میرے پاس کچھ بھی نہ رہا۔ میں تو کہکشاؤں میں ایک نقطے کی حیثیت بھی نہیں رکھتا تھا۔ میں سوچتا رہا کہ اب اپنے ہونے کا کیا جواز پیش کروں! جب میرا کوئی مستقر اور مقام ہی نہیں تو میری ہستی کی پہچان ہی کیا ہے! یہ بہت ہی سخت دھچکا تھا جو میری انا کو لگا اور وہ ریزہ ریزہ ہو گئی لیکن داناؤں نے اس سے بھی آگے کی بات کا دعویٰ کر کے مجھے بالکل ہی ملیا میٹ کر دیا۔ اُنھوں نے کہا کہ کہکشاؤں کا صرف یہی ایک گچھا نہیں جس کے اندر میری کہکشاں بھی ہے' اس لامتناہی کائنات کے اندر کہکشاؤں کے ایسے ہی لاتعداد گچھے یا جھرمٹ گردشِ مدام میں ہیں اور کسی نا معلوم منزل کی طرف رواں دواں ہیں۔ اُنھوں نے کہا کہ وہ اپنی طاقتور قوی ہیکل ریڈیائی دوربینوں کے ذریعے جہاں تک دیکھ سکتے ہیں' اُنھیں کہکشاؤں کے ایسے جھرمٹ ہی دکھائی دیتے ہیں کائنات کا کوئی کنارہ یا حد اُنھیں کہیں نظر نہیں آتی۔ ان کی اس بات نے تو مجھے گویا ختم ہی کر دیا۔ اس کا مطلب تو یہ تھا

کہ اس لامتناہی کائنات کے اندر میرے لیے کوئی جائے قرار نہیں' کوئی جگہ ایسی نہیں جسے میں اپنا گھر کہہ سکوں۔ اس احساس نے مجھے مایوسی اور افسردگی میں مبتلا کر دیا۔ ایک احساسِ بیگانگی تمام مظاہر کائنات سے بھی اور خود اپنی ذات سے بھی میری سائیکی کا حصہ بن گیا۔ چاند' ستارے' سورج' کہکشائیں اور میرے اردگرد پھیلی ہوئی تمام اشیا مجھ سے بیگانہ تھیں۔ میرے ساتھ ان کا سمبندھ نہیں تھا' وہ اپنی اپنی راہوں پر چل رہی تھیں' اپنا اپنا جیون بتا رہی تھیں' مجھ سے اُن کو کوئی سروکار نہیں تھا۔ میرے ہونے یا نہ ہونے سے ان کے لیے کوئی فرق نہیں پڑتا تھا۔ میں اپنی زندگی جیتا تھا۔ کبھی یہ ساری چیزیں میری خادم تھیں' میرے لیے سرگرمِ عمل تھیں' اب میں ان کا محتاج تھا۔ میری اپنی ہمت اور کوشش پر منحصر تھا کہ ان سے فائدہ حاصل کر سکوں۔ اب میں تنہا تھا' بالکل اکیلا!

اور اب لامتناہی کائنات کے اندر کوئی بھی جگہ ایسی نہیں تھی یا اُس وقت تک مجھے معلوم نہیں تھی جو مرکزِ کائنات ہوتی' جو ساکن ہوتی' جسے کسی کے لیے مستقر کہا جا سکتا' اور وہ نہ ہی کہیں شاید میری زمین پر پائی جانے والی زندگی موجود ہو۔ میں اس لامتناہی ویرانے میں تنہا تھا' بے مقام تھا' ایک خانہ بدوش کی طرح ہر لحظہ سفر میں تھا' گویا میں لامکانی تھا اور جو لامکانی ہوتا ہے وہ لازمانی بھی ہوتا ہے کیوں کہ زمان' مکان ہی ایک بُعد ہے۔

اپنی کم حیثیتی اور بے مائیگی نے مجھے اس قدر مایوس کر دیا کہ میں اپنی ذات کے تاریک گپھا میں چھپ کر بیٹھ گیا اور ایک مدت تک چھپا رہا۔ پھر یکایک میری ذات کے تاریک گپھا میں روشنی کا ایک کوندا لپکا۔ مجھے ایسا لگا جیسے مجھے نروان حاصل ہو گیا ہے۔ مجھ پر یہ بات واضح ہوئی کہ کائنات کے متعلق اس وقت تک جو کچھ جانا گیا ہے' وہ میں نے ہی جانا ہے۔ اس وسیع کائنات کے اندر میرے سوا اور کوئی ایسی ہستی نہیں جو کائنات اور مظاہرِ کائنات کا ادراک کر سکے۔ یہ میں ہی تو ہوں جو ہر شے کی حقیقت معلوم کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے۔ اور میں ہی اِس لامحدود کائنات کے اندر گرمِ سفر ہوں۔ اب میں اپنے اس احساس اور شعور کی وجہ سے شادماں اور خوش ہوں کیوں کہ اب بھی میں ہی مرکزِ کائنات ہوں اور مقصدِ کائنات بھی!!

محمد اسلام تبسم

بیزاری

بیزار رہنا میری پرانی عادت ہے۔ میں بچپن میں سوائے کھیل کود کے ہر کام سے بیزار رہتا تھا۔ جب ذرا بڑا ہوا اور اسکول جانے لگا تو تعلیم اور اساتذہ سے بیزاری کی عادت پختہ ہوگئی، میری اس بیزاری سے میرے تمام اُستاد انتقاماً مجھ سے بیزار رہنے لگے۔ وہ اتنے بیزار ہوئے کہ مجھے امتحان میں پاس کرتے چلے گئے، بیزار رہنے کی عادت اب میری مجبوری بن چکی ہے اگر کسی روز کسی بات پر بیزاری نہ ہو تو دن بھر منہ کا ذائقہ خراب رہتا ہے، جب کوئی کام شروع کرتا ہوں تو فوراً اُس کام سے بیزار ہو جاتا ہوں۔ اور جب کوئی کام نہ کروں تو کام نہ کرنے کے عمل سے بیزاری کا احساس ہوتا ہے میری اس عادت نے میرے تمام دوستوں کو مجھ سے بیزار کر دیا ہے لیکن میں اُن کی اس بیزاری سے بہت خوش اور مطمئن ہوں۔ اس لیے کہ اب مجھے کوئی وقت بے وقت تنگ نہیں کرتا اور نہ ہی کوئی اُدھار مانگنے والا آتا ہے۔

بیزاری انسان کو بلندی پر پہنچاتی ہے اور اُسے عظیم مرتبہ عطا کرتی ہے۔ اس لیے کہ بیزار وہی انسان ہوتا ہے جو اپنے گرد و پیش کی منافقت، جھوٹ اور نفرت کو محسوس کرتا ہے۔ دراصل بیزاری جھوٹ اور نفرت کے ردِ عمل کے طور پر پیدا ہوتی ہے۔ اگر کوئی ان چیزوں سے بیزار نہیں ہوتا تو وہ انسان نہیں۔ کیوں کہ انسان وہی ہے جو اس خوبصورت دنیا کو جھوٹ اور نفرت سے پاک دیکھنا چاہتا ہے، لیکن جب انسان کو ہر طرف جھوٹ نظر آئے اور سچ نام کی کوئی چیز نہ ہو تو وہ احتجاجاً اس دُنیا ہی سے بیزار ہو جاتا ہے۔ وہ دُنیا کو اس قابل نہیں سمجھتا کہ یہاں رہا جائے گوتم جب دنیا سے بیزار ہوا تو اُس نے بن باس اختیار کر لیا۔ سقراط نے دُنیا سے بیزار ہو کر زہر کا پیالہ پی لیا، اور منصور سولی پر چڑھ گیا۔ یہ سب لوگ بہت عظیم تھے اور تاریخ انھیں اچھے لفظوں میں یاد کرتی ہے۔ اپنی تاریخ کو بنانے یا بگاڑنے میں بیزاری کا بڑا عمل دخل ہے، جو قوم اپنے اوپر ہونے والے ظلم، جبر اور دھونس سے بیزار نہیں ہوتی وہ تاریخ میں کبھی زندہ نہیں رہتی۔ تاریخ ان ہی قوموں کو یاد رکھتی ہے جنھوں نے ہر چنگیز اور ہلاکو سے بیزاری کا اعلان کر کے اُسے کیفرِ کردار تک پہنچا دیا۔

اچھی شاعری تخلیق کرنے کے لیے بیزار رہنا ضروری ہے۔ بیزار شعرا اپنی شاعری میں نت نئے گُل کھلاتے ہیں۔ اس کے برعکس جو شعرا بیزار رہنے کے عادی نہیں اُن کی شاعری ایک ہی دائرے میں گھومتی ہے۔ وہ روایت پسندی کے دائرے سے باہر نہیں نکلتے، ایسی شاعری اور شاعر سے لوگ بہت جلد بیزار ہو جاتے ہیں۔ ایسے شاعر اگر کسی محفل میں اپنا کلام سنانے بیٹھیں تو لوگ بیزار ہو کر وہاں سے اُٹھنے لگتے ہیں۔ حکومت کو چاہیے کہ سیاسی جلسوں کو منتشر کرنے کے لیے لاٹھی کے بجائے اس قسم کے شعرا سے کام لے۔ یعنی اگر کسی جلسے کو منتشر کرنا درکار ہو تو دو تین اسی وضع کے شعرا اس کے سامنے کھڑے کر دیے جائیں جلسہ خود بخود منتشر ہو جائے گا۔

یُوں تو بیزار رہنے کے کئی اسباب ہو سکتے ہیں لیکن زیادہ تر لوگ محض اس لیے خود پر بیزاری کا خول چڑھا لیتے ہیں کہ وہ دوسروں سے منفرد نظر آئیں کیوں کہ بیزار رہنے والا چشم زدن میں عام آدمی سے خاص آدمی بن جاتا ہے۔ اُس کی شخصیت کو چار چاند لگ جاتے ہیں۔ وہ پُر وقار اور رعب دار نظر آتا ہے۔ اکثر دیکھنے میں آیا ہے کہ جب گاؤں کا کوئی نوجوان پڑھ لکھ کر کسی اچھے عہدے پر پہنچتا ہے تو وہ گاؤں کی ہر چیز سے بیزاری کا اظہار کرتا ہے۔ اُسے کیکر کی ٹھنڈی چھاؤں میں بیٹھنا اچھا نہیں لگتا۔ وہ دھوتی اور کُرتا پہننے میں شرم محسوس کرتے ہیں، مجھے اس قسم کے لوگ بالکل پسند نہیں جو اپنے نمود و نمائش کے لیے بیزار ہوتے ہیں' میں ایسے لوگوں سے مل کر ہمیشہ بیزار ہوتا ہوں۔ جو قوم اپنی ثقافت اور اپنے ملک کی اشیا سے بیزاری کا اظہار کرتی ہے وہ ہمیشہ دوسروں پر انحصار کرتی ہے۔ ایسے لوگوں کا اپنا کوئی تشخص ہوتا ہے اور نہ ہی اُن کی کوئی شناخت ہوتی ہے۔

کامیاب سیاست دان بننے کے لیے بیزار رہنا بہت ضروری ہے۔ آج کل سیاست میں انھی سیاست دانوں کا سکہ چلتا ہے جنھیں بیزار رہنے کا ہنر آتا ہے۔ اس کے برعکس جو سیاست دان بیزار نہیں رہتے وہ کبھی کامیاب نہیں ہوتے۔ حزبِ اختلاف کو حزبِ اقتدار اور حزبِ اقتدار کو حزبِ اختلاف سے ہمہ وقت بیزار رہنا چاہیے بلکہ اسمبلی میں بیٹھ کر اپنی اپنی بیزاری کا برملا اظہار کرنا چاہیے۔ متصادم ہونے کے بجائے بیزاری کا اظہار کرنے ہی میں ہم سب کی سلامتی ہے۔ البتہ سیاستدانوں کو عوام سے بیزار نہیں ہونا چاہیے۔ یہی وجہ ہے عقل مند سیاست دان عوام سے کبھی بیزار نہیں ہوتے اور اگر بیزار ہوں تو اس کا اظہار نہیں کرتے۔

بیزار ہونا انسان کی فطرت ہے۔ انسان دُنیا میں آتے ہی رو رو کر اپنی بیزاری کا اظہار کرتا ہے

جیسے اُسے دنیا میں زبردستی بھیجا گیا ہو، انسان عمر کے ہر حصے میں کسی نہ کسی طرح اپنی بیزاری کا اظہار کرتا رہتا ہے مثلاً بچپن میں وہ گھر کی چیزوں کو توڑ پھوڑ کر اپنی بیزاری کا اظہار کرتا ہے، جوانی میں بسیں جلا کر یا کلاشنکوف چلا کر بیزار ہوتا ہے اور عمر کے آخری حصے میں جب اُس کے پاس بیزار ہونے کے لیے کچھ نہیں بچتا تو وہ نوجوانوں کو بُرا بھلا کہہ کر بیزار ہو لیتا ہے۔ اس کی فطرت ہے کہ وہ ایک جیسے ماحول میں زیادہ عرصہ رہے تو ماحول سے بیزار ہو جاتا ہے، انسان ہر لحہ تبدیلی چاہتا ہے، کہتے ہیں جب خدا نے آدمؑ کو پیدا کیا تو انھیں جنت میں ہر طرح کی آسائش فراہم کی۔ آدمؑ کچھ عرصہ تو جنت کی نعمتوں سے جی بہلاتے رہے لیکن بہت جلد وہ اپنی تنہائی سے بیزار ہو گئے۔ خدا نے اُن کی تنہائی دُور کرنے کے لیے حوّا کو پیدا کیا، کیوں کہ انسان جب تنہا ہو تو صرف عورت کے بارے میں سوچتا ہے، لیکن عورت انسان کی تنہائی تو دُور کر سکتی ہے اُس کی بیزاری کا کچھ بگاڑ نہیں سکتی۔ آدمؑ کے ساتھ بھی یہی کچھ ہوا، وہ اپنی بیزاری دُور کرنے کے لیے زمین پر آ گئے، اُس وقت سے اب تک اولادِ آدم بیزاری دُور کرنے کی سعیِ مسلسل میں مصروف ہے، مگر تا حال بیزاری کے کمبل سے نجات حاصل نہیں کر سکی۔

جو لوگ بیزار ہونے والوں کو طعن و تشنیع کا نشانہ بناتے انھیں شاید یہ معلوم نہیں ہے کہ بیزار ہونا انسان کا پیدائشی حق ہے اور یہ واحد حق ہے جسے آج تک کوئی غصب نہیں کر سکا۔ انسان کے بنیادی، جمہوری، سیاسی اور معاشرتی حقوق ازل سے پامال ہوتے آئے ہیں۔ اور ان حقوق کے حصول کے لیے انسان کسی نہ کسی انداز میں جدوجہد کرتا نظر آتا ہے، لیکن بیزار ہونا اُس کا ایسا حق ہے جس سے آج تک بڑے سے بڑا آمر بھی اُسے محروم نہیں کر سکا۔ آپ دُنیا کے کسی ایک حکمران کی مثال بھی نہیں دے سکتے جس سے کوئی بیزار نہ ہو۔ اگر ساری رعایا بھی خوش ہو تو ولی عہد کو بیزار ہونے سے کون روک سکتا ہے۔

میں بیزار ہونے کو تخلیقی عمل کا حصہ سمجھتا ہوں اور میری یہ بیزار کُن رائے ہے کہ اگر انسان میں بیزار ہونے کی صلاحیت موجود نہ ہوتی تو ایک طرف ہم اعلیٰ پائے کے ادب اور دیگر فنونِ لطیفہ سے محروم رہ جاتے اور دوسری طرف ابھی تک غاروں ہی میں بیٹھے اونگھ رہے ہوتے۔ ایک دوست کو میری اس بات پر اعتراض ہے کہ ہم فنونِ لطیفہ کا تعلق بیزاری سے جوڑتے ہی کیوں ہیں۔ وہ اس رائے سے بھی متفق نہیں کہ اپنے گرد و پیش کی صورتِ حال اور خود اپنی ذات سے بیزاری اور بے نیازی ہی اعلیٰ ادب کی تخلیق کی ضامن ہے۔ اُس کا کہنا ہے کہ اگر شاعر یا ادیب ادب تخلیق کرنے سے ہی بیزار ہو جائے تو کیا یہ ادب کے لیے زیادہ سُود مند نہ ہو گا۔

بیزاری کے ثمرات کی قدم قدم پر مثالیں دی جاسکتی ہیں، مثلاً اگر انسان زمین کی یکسانیت سے بیزار نہ ہوتا تو چاند پر کیسے قدم رکھ سکتا تھا، مشینی پرزے کی طرح روز و شب گزارنے والوں کے لیے بیزاری کوئی مسئلہ نہیں کیوں کہ ان کے اندر اپنے ماحول کے جمود کو توڑنے کی خواہش ہی پیدا نہیں ہوتی۔ ہر شے پر ایک متعین عرصے کے بعد زنگ آ جاتا ہے۔ جس کی کو یہ زنگ نظر نہ آئے وہ انسان نہیں روبوٹ ہے، مگر جسے نظر آ جائے وہ اس سے بیزار ہو کر اسے کھرچنا چاہتا ہے اور یہی وہ وقت ہے جب وہ نئے جہانوں کی دریافت کے لیے روانہ ہو جاتا ہے۔ کولمبس اگر اسپین کی بند دنیا سے بیزار نہ ہو گیا ہوتا تو کیا آج امریکہ پر ریڈ انڈین قوم کا پرچم لہرا رہا ہوتا؟ امریکی قوم کو کولمبس کی بیزاری کا ممنون ہونا چاہیے کہ اس کے صدقے آج وہ پوری دنیا کو بیزار کرنے میں کامیاب ہو گئی ہے۔

☆☆☆☆

شاہد شیدائی

اشارے

اشارہ بھی کیا خوب چیز ہے کہ شاعری میں رمز، کنایے اور ایما کا کام دیتا ہے اور روزمرہ میں عشق و عاشقی، حکم، مرضی، مطلب اور کسی کو کسی کام پر اُکسانے یا بھڑکانے کی راہ سمجھا جاتا ہے۔ گویا اس ایک لفظ کی تہہ میں معانی کے کئی جہاں آباد ہیں۔

لغت سے رجوع کریں تو اشارہ کرنا، اشارہ پانا، اشارہ بازی، اشارے پر چلنا، اشارے پر اُگانا، اشارے پر لگنا، اور جانے اس سے کیا کیا ترکیبیں اور محاورے وضع ہوتے دکھائی دیتے ہیں۔۔۔ مگر مجھے تو یہ لفظ ایک سیدھا سادا، جیتا جاگتا کردار نظر آتا ہے جس کے اشارے پر میں صبح سے شام تک ایسے کاموں میں جُتا رہتا ہوں جو لمحہ بہ لمحہ مجھے اشارے کرتے رہتے ہیں یعنی ایک کام ابھی ختم نہیں ہوتا اور دوسری جانب سے اشارہ ہو جاتا ہے کہ ہم بھی تو پڑے ہیں راہوں میں۔!

اس اشارے نے جہاں کئی بگڑے کام سنوارے ہیں، وہاں ان گنت رواں دواں کاموں میں بگاڑ کی صورت بھی پیدا کی ہے۔ مثلاً مجھے اشارہ ملتا ہے کہ میں دُور دراز کے فلاں مقام پر پہنچ جاؤں اور پہاڑ کی چوٹی پر براجمان باباجی کے چرن چھو لوں تو میری بگڑی تقدیر سنور جائے گی، مگر وہاں سے واپسی کا اشارہ پا کر جب میں اُسی مقام پر لوٹ آتا ہوں جہاں سے چلا تھا، تو مجھ پر یہ راز کھلتا ہے کہ تقدیر تو تدبیر سے بنتی ہے، اس کے لیے دن رات تگ و دو کی ضرورت ہوا کرتی ہے، بابا لوگ تو اشاروں میں فقط یہ بتاتے ہیں کہ کسی خیرخواہ نے کالے جادو کے ذریعے تمام راستے بند کر رکھے ہیں۔ اسی طرح جب کوئی شخص کسی کے اشاروں پر چلتا ہے تو اس عمل کے دوران میں اُس کی اپنی شخصیت مسخ ہو جاتی ہے اور وہ کسی نہ کسی گناہِ کبیرہ کا مرتکب بھی ہو سکتا ہے۔ لہٰذا میں تو آپ کو یہ مشورہ کبھی نہیں دوں گا کہ آپ کسی کے اشاروں پر چلیں یا کسی کو اپنے اشاروں پر لگائیں۔

اشارہ بازی کے ذریعے جہاں کوئی دل پھینک عاشق کسی الھڑ کو دامِ الفت میں پھنسانے میں کامیاب ہو سکتا ہے، وہاں اُسے ہرگز یہ نہیں بھولنا چاہیے کہ یہ اشارے بازی اُس کی ہڈی پسلی ایک کرنے

کا بہانہ بھی ہوسکتی ہے یعنی وہ محبت کے خواب اندر خواب جھولتے چمن زاروں میں مدغم ہونے کے بجائے ذلت کے خاک در خاک پھیلے خارزاروں میں ہمیشہ کے لیے گم بھی ہوسکتا ہے!

اشارہ آنکھ سے بھی ہوسکتا ہے اور ہاتھ سے یا اُنگلی سے بھی۔ مگر اُس مقام کو آپ کیا نام دیں گے جہاں پورا انسانی جسم، سراپا اشارہ بن جاتا ہے! ایسی حالت میں انسان اشارہ کرنے کے قابل نہیں رہتا، البتہ باقی لوگ آنکھ، ہاتھ یا اُنگلی کے اشارے سے اُس کی خوبیاں بیان کرتے چلے جاتے ہیں!

بڑی شاہراہوں کی بغلوں میں آویزاں اشارے، ایک طرف ہمیں راستے کی مشکلات کا حل بتاتے چلے جاتے ہیں کہ آگے چڑھائی، موڑ یا کوئی پُل ہے اور دوسری طرف ہمیں پرانے پتھر کے زمانے میں لے جاتے ہیں جب انسان نے اشاروں کی زبان میں لکھنا سیکھا تھا۔ میں سوچتا ہوں، جب آج کے اس ترقی یافتہ دور میں بھی ہم اُسی پرانی اشاراتی لکھت کے سہارے سفر در سفر منزلیں طے کرتے ہیں تو کیا اُس دور کا انسان ہم سے زیادہ طاقتور دماغ کا حامل نہیں تھا جسے ہم نے تاریخ میں جاہل، گنوار اور نجانے کیا کیا نام دے رکھے ہیں! سچی بات یہ ہے کہ ہم آج تک اشاروں کی زبان سے اُسی طرح منسلک ہیں جس طرح ایک گونگا بہرا شخص اپنے ساتھی سے بات کرنے پر مجبور ہے۔۔۔۔ تو گویا طے پایا کہ روایت سے بغاوت نام کی کوئی شے یہاں موجود ہی نہیں، اور جب تک ہم بنیاد پر سے دیوار نہیں اُٹھائیں گے، عمارت کے دھڑام سے زمین بوس ہو جانے کا احتمال ہمیشہ باقی رہے گا۔

راہ چلتے، اُٹھتے بیٹھتے حتیٰ کہ سوتے جاگتے بھی، ہم اشاروں میں بات کرنے کے عادی ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ہماری راہوں میں بے شمار اشارے بکھرے پڑے ہیں۔ میں جب کسی موٹر رکشا، ٹیکسی یا بس میں سوار ہو کر کسی ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل ہونا چاہتا ہوں تو راستے میں ڈرائیور کو کئی قسم کے اشاروں سے دوچار ہونا پڑتا ہے۔ مثلاً کسی جگہ کوئی سائیکل سوار یا ریڑھی بان اشارہ دیے بغیر اچانک دائیں یا بائیں مڑ جاتا ہے اور گاڑی کی چیختی چنگھاڑتی بریک کی وجہ سے میں بری طرح آگے کی طرف لڑھک جاتا ہوں۔ اشارہ کہتا ہے کہ میں اُٹھ بیٹھوں مگر گھٹنے پر لگی چوٹ کچھ اور ہی اشارہ دے رہی ہوتی ہے۔

چوراہوں پر لگے اشارے اس بات کی ضمانت ہیں کہ ہم اگر سُرخ، سبز اور پیلی روشنیوں کی زبان کو سمجھتے ہوئے اُن پر عمل کریں گے تو وہ بلاشبہ ہمیں ہر قسم کے حادثات سے محفوظ رکھیں گی، اور اگر ہم نے اُن کے اشاروں سے ذرہ بھر بھی روگردانی کی تو ہمارے لیے موت کا اشارہ بھی بن سکتی ہیں۔

ایک عاشق، رات کے وقت، چانداور ستاروں کے اشارے سنتااور خیال ہی خیال میں ہجر کے بیاباں سے جست لگا کر وصل کی وادی میں پہنچ جاتا ہے۔صوفی میں یہ ہی اشارے، انجذاب کی کیفیت پیدا کر دیتے ہیں اور وہ ذات کے اعماق میں غوطہ زن ہو جاتا ہے جب کہ ایک سائنس دان کا دماغ' ایٹم کے ٹوٹنے کا اشارہ سوچتے ہی پورے کرۂ ارض کی تباہی کا منظر دیکھنے میں مصروف ہو جاتا ہے۔اگر دوسرے رخ سے سوچیں تو ان تمام تر کیفیات میں ایسے اشارے مضمر ہیں جو سمندروں میں جزرومد' آسمانوں میں کوندے اور زمینوں میں شادابیوں کے ذخیرے پیدا کرتے چلے جاتے ہیں۔۔۔۔ یہ پیڑ یہ پرندے، یہ رم جھم یہ برکھا، یہ پھول یہ سبزہ، یہ لہلہاتے کھیت، یہ ندی نالے، یہ باغ و بہار یہ نظارے' سب قدرت کے اشارے ہیں۔آپ چاہیں تو انھیں زندگی کی شاہراہوں پر نہایت خوبصورتی سے آویزاں کر کے ہمیشہ کے لیے محفوظ ہو سکتے ہیں' ورنہ ویرانیوں کے دیوہیکل اشارے تو ہر موڑ پر دور ہی سے دکھائی دے رہے ہیں۔

اس سب کے ساتھ ساتھ، مجھے بوعلی سینا کی طرح ''اشارات'' سے بہت لگاؤ ہے۔وہ یوں کہ جب میں کوئی نظم یا غزل کہتا ہوں تو سیدھے سبھاؤ میں بات کرنے کے بجائے مجھے اشاروں کنایوں میں شعر کہنا بہت اچھا لگتا ہے کہ اس طرح تخلیق میں جگہ جگہ کھائیاں پیدا ہو جاتی ہیں اور میرا قاری یا نقاد جب ان کھائیوں کو عبور کر کے متن کے متوازی کوئی اور متن دریافت کرتا ہے تو مجھے یوں لگتا ہے جیسے میری ہستی کو پر لگ گئے ہیں اور میں خلاؤں کے دور دراز سفر پر روانہ ہو گیا ہوں' ہر چند کے میرے قدم زمین سے جڑے رہتے ہیں اور میں اشاروں ہی اشاروں میں اس لمبے سفر سے واپس بھی آ جاتا ہوں!

☆☆☆☆

عبدالقیوم

چاندنی رات

رات ہوتے ہی جب اندھیرے کی چادر کرۂ ارض پر تن جاتی ہے تو مجھے یوں محسوس ہوتا ہے جیسے خاموشی نے بھی اپنے پر چاروں اور پھیلا دیے ہیں۔ اندھیرے اور خاموشی کا گٹھ جوڑا کثر میرے جذبات میں سرد سی لہریں دوڑا دیتا ہے! لیکن جب اندھیرے کو چیر کر چاند اپنی من موہنی' روشن روشن صورت لیے نمودار ہوتا ہے تو میرے جذبات واحساسات میں زندگی کے آثار بیدار ہونے لگتے ہیں اور میں بیتے دنوں کی گرد صاف کر کے ماضی کے گلستان میں پہنچ جاتا ہوں۔ تب کتنی ہی سہانی اور دل آویز یادیں میرے دل ودماغ کو زندگی بخش حرارت سے نہال کر دیتی ہیں۔

میرے بچپن کی بہت سی یادیں چاندنی راتوں سے وابستہ ہیں۔ ڈراؤنے دیوؤں اور جن پریوں کے قصے کہانیاں سنا کر مجھے گھر میں قید رکھا جاتا' لیکن میں اپنے سنگی ساتھیوں کے ساتھ کھیلنے کودنے کے شوق میں' اُن فرضی قصوں کو ذہن سے جھٹک کر چپکے سے کھسک جاتا اور جی بھر کھیلنے کے بعد واپس لوٹتا۔ چاندنی رات ہم بچوں کے لیے آزادی کا سندیسا لاتی اور ہم تا دیر مدھ بھری چاندنی میں مختلف کھیلوں میں اس طور مگن رہتے کہ وقت گزرنے کا احساس ہمیں چھو کر بھی نہ گزرتا تا وقتیکہ گھر کا کوئی بڑا کان سے پکڑ کر نہ لے جاتا۔ اس مداخلتِ بیجا پر ہمارا دل روتا۔۔۔۔ میں بستر پر لیٹ کر بھی چاندنی رات کے خوابوں میں گم رہتا اور چاندنی کی وادی میں مٹر گشت کرتا۔ ذہن تھک جاتا تو کسی وقت نیند کی دیوی اپنی مہربان بانہوں میں سمٹ لیتی۔

لیکن آج یہ کیفیت ہے کہ چاندنی راتیں بھی بچوں کو موہ لینے کی صفت سے محروم ہوگئی ہیں۔ سائنسی ترقی نے ہماری تہذیبی اقدار کو مسندِ اقتدار سے محروم کر کے ہمیں نئی دنیا کی تلخیوں کے جام پلا کر' مدہوش کر دیا ہے' جس کے نتیجے میں ہم آزادہ روی اور بےفکری کے عناصر سے ہاتھ دھو بیٹھے ہیں۔

میں تو شہر کا باسی ہونے کے باوجود چاندنی رات کے سحر کا اسیر ہوں۔ میرا خمیر ایک چھوٹے سے گاؤں سے اُٹھا تھا۔۔۔۔ شاید اسی لیے میری دیہی فطرت پوری طرح شہر کے رکھ رکھاؤ کی مطیع نہ ہو

سکی۔ جب بھی چاند پوری آب وتاب کے ساتھ شرارتی بچے کی طرح بادلوں میں لک چھپ کی آنکھ مچولی کھیلنے لگتا ہے' میں چھت کے ٹھنڈے ٹھار فرش پر پڑی دری پر لیٹ کر اندھیرے اجالے کی اس کیفیت سے خوشی کے لمحات کشید کرتا ہوں۔۔

اردگرد کے ماحول سے مکمل طور پر بے تعلق ہو کر' چاند سے ناتا جوڑ لیتا ہوں تو مجھے یوں لگتا ہے جیسے چاند' بے صبر شخص کی طرح' آنکھیں بند کیے، تیز رفتاری سے کسی نامعلوم منزل کی طرف آگے چلا جا رہا ہے اور چھدرے، بکھرے بکھرے، ملگجے' سیاہ بادل اُس کا راستہ روکنے کی سعیِ رائیگاں میں مصروف ہوں۔

دراصل چاند اور بادلوں کی یہ آنکھ مچولی مجھے اس قدر مسحور کر دیتی ہے کہ میں بڑے غور اور انہماک سے ان کے ادلتے بدلتے پینتروں سے لطف ہونے لگتا ہوں۔ تب میرا ذہن دنیاوی جھمیلوں کے مضبوط حصار کو توڑ کر' مجھے آزادی سے ماضی بعید میں لے جاتا ہے اور میں خوابناک کیفیت کے سُرور میں آنکھیں بند کر کے ماضی کی یادوں میں کھو جاتا ہوں۔

مجھے گاؤں کی الھڑ مٹیاروں کے لوک گیت نہیں بھولتے جن میں تلخیوں سے خوشی کے لمحات چھین لینے کی تاکید ہوتی تھی: مثلاً: ''کون جانے موت کب آ کر ہمیں بے بس کر دے اور یہ یادیں پھر زندہ رہنے والیوں کے ذہنوں میں رہ جائیں کہ ہم کبھی چاندنی راتوں میں اکٹھے کھیلا کرتیں تھیں' ہنسی مذاق میں وقت گزارتی تھیں۔۔۔۔''

مجھے اس مخصوص کھیل کا وہ حصہ سب سے زیادہ اچھا لگتا جب آخر میں وہ سب' لوک گیت کا ایک ٹکڑا کورس کے انداز میں بڑے مترنم لہجے میں گاتیں۔

جب کبھی میں تنہائی کے حصار میں محبوس' سوچ کی لہروں پر تنکے کی طرح ڈانواں ڈول بہے جاتا ہوں؛ ذہن مجھے اُس سنہری دور کی پُرسکون وادی میں لے جاتا ہے جب میری عمر چھ سات سال کی تھی اور میں بھرپور چاندنی رات میں کسی کشادہ گھر کے دالان میں گاؤں کی نوخیز' جوانی کی سیڑھی پر قدم رکھتی لڑکیوں کو دیگر خواتین کے ساتھ کھیلتے اور ناچ گانے میں مشغول دیکھنے کے شوق میں ایک طرف کونے میں کھڑا ہو کر' اُن کے نازنخروں، خوشیوں سے چمکتے حسین چہروں کے ساتھ ہاؤہُو کی یلغار سے محظوظ ہوا کرتا تھا۔ کبھی کبھی کسی بے حد خوبصورت چہرے میں ایسے کھو جاتا کہ میری نظریں صرف اُسی کا تعاقب کرتی رہتیں۔۔۔۔ یوں لگتا جیسے اُس کی دل موہ لینے والی صورت سے میری آنکھیں چپک گئی

ہوں۔ ایک بار ایسا ہی جاذبِ نظر' انتہائی دلکش چہرہ جب میری نظروں کے حصار میں آ گیا تو اُس نے جیسے میرے دل کا چور پکڑ لیا تھا۔ پھر وہ ہنستے ہوئے میرے پاس دوڑے چلے آئی اور اُس نے مجھے اپنے بازوؤں میں اُٹھا لیا؛ ہوا میں بلند کر کے میرا منہ چوم لیا اور بولی "بڑا نٹ کھٹ ہے تُو!" پھر جب تک وہ حسن کی دیوی میری توجہ کا مرکز بنی رہی، مجھے یوں محسوس ہوا جیسے میں بھی اُس کی دلچسپیوں میں شامل ہو گیا ہوں ۔۔۔۔ اپنائیت اور چاہت کے بے پایاں احساسات جیسے میرے انگ انگ میں جاگ اُٹھے تھے۔

چاندنی رات کا طلسم جب اپنے جوبن کا جادو جگاتا ہے تو دلوں میں چڑھتے دریا کی لہراتی بل کھاتی محبت کی موجیں جنم لیتی ہیں؛ دنیا اُجلی اُجلی اور ماحول خوشگوار لگنے لگتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ چاندنی رات سے مسرت و بہجت اور سرشاری کے جذبات جنم لیتے ہیں۔ چاندنی رات کی قدر وہی لوگ جانتے ہیں جو اُجلا من اور پیار بھرا دل رکھتے ہوں۔ چاندنی رات میں کوئی ان دیکھی طاقت انسان کے اعصاب کو اپنی مسحور کُن کرنوں کے ہالے میں لے کر' جذبات و احساسات میں نرم روی پیدا کر دیتی ہے۔ اندھیرا تو بڑے سے بڑے گناہ کے پہاڑ کو اپنے دامن میں سمیٹ کر' دنیا میں بدی کی راہ ہموار کر دیتا ہے۔ میں سوچتا ہوں اگر چاندنی رات کا وجود نہ ہوتا اور سرِ شام ہی ہر سُو اندھیرے کا راج ہو جاتا تو یہ دنیا نرک سے کسی طور کم نہ ہوتی۔

جوانی کا دور انسانی زندگی میں چاندنی رات کی طرح دلفریب اور سہانا' لیکن مختصر ہوتا ہے۔ اس دور میں چمکتے دمکتے حسین چہرے ہی توجہ کے مستحق ٹھہرتے ہیں۔ چار دن کی اس چاندنی کے گزرنے کا احساس بالکل نہیں ہوتا؛ اس کے بعد بڑھاپے کا اندھیرا' ڈراؤنی گھپ رات کی طرح اعصاب کو جکڑنے لگتا ہے، تب پتا چلتا ہے کہ زیست کی رونق ماند پڑ گئی ہے اور دھیرے دھیرے اب زندگی کے دشمن مہلک عوارض، گرو پر بھنبھناتی مکھیوں کی طرح جمع ہونا شروع ہو گئے ہیں۔ جب میں جوانی کے دور پر غور کرتا ہوں تو پتا چلتا ہے کہ قدرت نے انسانی زندگی کو مختلف روپ تو عطا کر دیے ہیں لیکن جوانی کا زمانہ ہی ایسا انوکھا ہوتا ہے جس میں دنیا بھر کی لذتیں اور نعمتیں کشادہ دلی کے ساتھ بازو پھیلائے' سینے سے لگانے کے لیے تیار رہتی ہیں؛ لیکن جب یہ دور گزر جاتا ہے تو لگتا ہے جیسے کسی نے سب کچھ چھین لیا ہو اور انسان تہی دست ہو جاتا ہے۔ بچپن اور لڑکپن' بے فکری کا دور کہلاتا ہے اور جوانی کا گزرا وقت ہی حاصلِ زیست لگتا ہے۔ بڑھاپا غم و فکر کی لمبی رات کی طرح ہوتا ہے جس میں سے گزرتے ہوئے انسان دوسرے جہاں کی طرف جا نکلتا ہے۔

وقت کی کروٹیں بہت کچھ بدل کے رکھ دیتی ہیں۔ عرصے سے مغرب کی خودفراموشی کی حامل رسموں نے ہماری تہذیبی اقدار کی روشنی مدہم کرنا شروع کر دی ہے۔ اب تو چاندنی راتوں کی کشش محبت کے مارے دلوں سے بھی مٹتی جا رہی ہے۔ پُرکشش اور دل میں جادو جگانے والی ملاقاتوں کا سلسلہ قصہء پارینہ بنتا جا رہا ہے۔ لوگ سینما ہاؤس کے اندھیروں اور کلب میں چاندنی رات کے مشابہ برقی قمقموں کی روشنی میں کھلم کھلا محبت کی پینگیں بڑھاتے ہیں' اور متمول خاندانوں سے تعلق رکھنے والے اکثر نوجوان ''پوِتر محبت'' سے چار قدم آگے نکل جاتے ہیں۔ اس کھیل میں نہ تو کسی کو بدنامی کا ڈر ہے اور نہ ہی کسی قسم کی مخالفت کا خوف۔ کومل اور سجل جذبات' جن کی تہہ میں محبت کے سچے موتی ہوا کرتے تھے، اب اُن کی تلاش میں خالی سیپیاں ہی ہاتھ آتی ہیں!!!۔۔

جاوید اصغر

کروٹ لینا

کروٹ لینے کو میں ہمیشہ معمولی فعل سمجھتا تھا۔ خود ایک مدت تک میرا یہ خیال تھا کہ کروٹ لینا ایک ارادی فعل ہے اور یہ انسان کے مزاج، موڈ اور ارادے پر منحصر ہے کہ وہ جب چاہے کروٹ لے اور جتنی دیر چاہے ایک ہی رخ بغیر کروٹ لیے لیٹا رہے۔ لیکن گزشتہ دنوں جب میری کمر میں درد تھا، مجھ پر انکشاف ہوا کہ حالات کی اِس ترتیب میں بعض لمحے ایسے بھی آتے ہیں جب انسان کا اپنے جسم کے اعضا پر اختیار ممکن نہیں رہتا اور ایسے معمولات جنھیں وہ ایک مدت سے انجام دیتا چلا آیا ہے، اُس کی دسترس میں نہیں رہتے، اور اُسے ایسی نعمتوں کا احساس تب ہوتا ہے جب وہ اس سے چھن جاتی ہیں۔ کمر میں درد کیا ہوا میں کروٹ لینے کو ترس گیا۔ کروٹ لینا میرے نزدیک سب سے بڑی خواہش، آسودگی اور عیاشی بن گیا۔ ایک ہی رخ لیٹے لیٹے زندگی مجھے یکسانیت کا شکار نظر آنے لگی اور مجھے محسوس ہوا کہ کروٹ محض رُخ بدلنے کا نام نہیں بلکہ جمود کے مقابلے میں حرکت اور یکسانیت کے مدِ مقابل رنگارنگی اور چہل پہل کے ساتھ فلسفۂ جبر و قدر کا ایک درس ہے۔ کمر درد سے مجھ پر یہ حقیقت بھی کھل گئی کہ جسم کے تمام کل پرزے کتنے متحد، یکجان اور ایک دوسرے کا احساس رکھنے اور ہمدردی کرنے والے ساتھی ہیں کہ ایک عضو میں بگاڑ پیدا ہوتے ہی دوسرے اعضا انسان کے حکم کی تعمیل میں لیت و لعل برتنے لگتے ہیں! اور میں سوچنے لگا کہ انسان کو اپنے اعضا کی اس وحدت کے بھی اتحاد و اتفاق اور ہمدردی کا درس لینے کے لیے کسی فلسفی کے افکار کی پیروی کی ضرورت ہے یا نہیں؟

ذرا سے کمر درد نے جسم کی ہیئت کذائی تبدیل کر کے رکھ دی۔ کروٹ لینا میرے نزدیک معمول کی کارروائی نہ رہا بلکہ زندگی کی علامت بن گیا۔ آپ نے بھی مشاہدہ کیا ہو گا کہ شدید بیمار شخص کے تیمارداروں کے لیے مریض کی ایک کروٹ یا ذرا سی ہلچل امید کی کرن بن جاتی ہے۔ زیادہ دیر تک چت لیٹے ہوئے آدمی کو کروٹ دلوا کر اس کی حیات و ممات کا فیصلہ کیا جاتا ہے۔ کروٹ لینا دراصل صحت اور زندگی کی علامت ہے لیکن رات کے وقت خراٹے لینے والے کو اُس لیے کروٹ بدلنے کے لیے کہا جاتا کہ اُس کے خر

اُنے رات کے سکوت کو شور آشنا کرتے ہیں جس سے رات کی معنویت تبدیل ہونے کا امکان پیدا ہو جاتا ہے۔ پھر یہی کروٹ فطرت کے بہاؤ میں تسلسل پیدا کرتی ہے۔ لیکن کبھی کبھی یوں بھی ہوتا ہے کہ ایک ہی رُخ پر بہنے والے دریا جب کروٹ لیتے ہیں تو سینکڑوں ایکڑ رقبہ دریا برد ہو جاتا ہے، بستیاں دریا کو اوڑھ لیتی ہیں اور نقشے تبدیل ہو جاتے ہیں۔ پُرسکوں پہاڑوں کی کروٹ جب زلزلے یا آتش فشاں کی صورت اپنا اظہار کرتی ہے تو یہ احساس ہوتا ہے کہ کروٹ لینا محض زندگی کی علامت نہیں، موت کا سندیسا بھی ہے اور زندگی اور موت اس کائنات کی تکمیل کے مظاہر ہیں۔ گویا کائنات کا وجود مسلسل کروٹ لینے کا عمل ہے۔

حالات جب کروٹ لیتے ہیں تو پس منظر اور پیش منظر کو یکسر تبدیل کر دیتے ہیں لیکن یکسانیت کے شکار، آسمان کی طرف منہ اُٹھا کر دعا مانگنے والے معاشرے کے مایوس لوگ حالات کے کروٹ لینے کا انتظار تو کرتے ہیں عملاً کچھ نہیں کرتے۔ کروٹ جو بیداری اور خواب کی درمیانی کڑی ہے، اپنے اندر حرارت، حرکت، توانائی اور زندگی کے تمام اجزا رکھتی ہے اور انسان کو دعوتِ نظارہ بھی دیتی ہے۔ چناں چہ ایک سمت میں لیٹا ہوا شخص جب کروٹ بدل کر دوسری طرف دیکھتا ہے تو اُس کے سامنے کی دنیا ہی بدل چکی ہوتی ہے۔ آگے کا پیش منظر پچھلے پس منظر سے مختلف ہوتا ہے۔ زیادہ کروٹیں لینا اور بار بار پہلو بدلنا انسان کے اندرونی اضطراب کو ظاہر کرتا ہے۔ گویا یہی کروٹ چہرے پر دل کی بے قراری، بے چینی اور بے تابی کا خارجی مظہر بن جاتی ہے۔ اسی لیے عشاق، محبوب پر اپنے دل کی بے تابی کا حال بستر کی شکنوں اور کروٹوں کی ضربِ تقسیم سے ظاہر کرتے ہیں۔ بار بار یوں کروٹیں لینے کا عمل جہاں محبت کا راز فاش کرنے کا موجب بنتا ہے، وہاں محبت میں مبتلا ہونے کی علامت بن کر سامنے بھی آتا ہے۔ کروٹ لے کر بیدار ہونا دراصل نئی زندگی کا آغاز کرنا بھی ہے اور کاہلی، سستی اور بے عملی کے خلاف اعلانِ جنگ بھی۔ گئے وقتوں میں جب چور، صاحب خانہ کو رات کے وقت خوابِ خرگوش کے مزے لیتا دیکھ کر گھر میں داخل ہوتے تو اُن کا ایک ساتھی یہ دھیان ضرور رکھتا کہ صاحب خانہ کہیں کروٹ نہ لے لے۔ اُس کی کروٹ چوروں کے لیے خطرے کا الارم ہوتی۔ بعض درویش صفت لوگ تو ایسے موقع پر دانستہ کروٹ نہیں بدلتے تھے تاکہ لوٹنے اور لٹنے والوں یعنی دونوں کا بھرم رہ جائے۔

میں تو کروٹ کو محض کروٹ نہیں سمجھتا بلکہ اپنا تہذیبی اور تمدنی ورثہ سمجھتا ہوں۔ اگر ایسا نہیں تو پھر آپ ہی کہیے کہ بڑی بوڑھیاں جب کسی نوجوان خاتون کو بالکل سیدھا لیٹے دیکھتی ہیں تو فوراً کروٹ بدل کر سونے کی تلقین کیوں کرتی ہیں!

صفدر رضا صفی

بک شیلف

کبھی کبھی میں سوچتا ہوں کہ اگر میں نے کتاب دوستی نہ اپنائی ہوتی تو میرا فالتو وقت کس طرح گزرتا؟ اور یوں بھی میرے پاس تو دوسرے لوگوں سے شاید کچھ زیادہ ہی وقت فالتو نکل آتا ہے کیوں کہ سال میں کم وبیش ایک یا ڈیڑھ مہینہ ضرور مجھے بسترِ علالت پر گزارنا پڑتا ہے۔ گذشتہ دنوں بھی میں اپنی ''سالانہ بیماری'' کے ہاتھوں صاحب فراش تھا کہ میرے گھر والوں نے بہ زور مجھے بستر اور کمرے تک محدود کر دیا تا کہ میری مذکورہ بیماری ''طول'' نہ پکڑ سکے، کم وبیش دس پندرہ دن تک میری دُنیا فقط کمرے کے اندرونی ماحول تک محدود ہو کر رہ گئی۔ چاروں طرف ایستادہ سنگی دیواریں، میز، کرسیاں، پنکھا، دروازے اور نیم تاریکی جیسے میری بصارت میں رچ بس سے گئے۔ حسبِ عادت چند دن تو میں نے کتابوں کی معیت میں گزارے لیکن ایک ہفتے کے لگا تار مطالعہ نے کتابوں سے بھی جی اُچاٹ سا کر دیا۔ میری نظریں آس پاس کی چیزوں پر بار بار جھپٹتیں مگر ہر طرف پھیلا بے مائیگی کا تنگ دامن انھیں واپس پلٹنے پر مجبور کر دیتا۔ آخر میں اُکتا کر اُٹھا اور ہاتھ میں موجود شاعری کی ایک خوبصورت کتاب بک شیلف میں پٹخ دی۔ عجلت اور اُکتاہٹ کی وجہ سے شاید میں کتاب کو اچھی طرح بک شیلف میں رکھ نہیں سکا تھا۔ اسی لیے وہ دوسری کتابوں کے حُسنِ ترتیب کو بھی متاثر کرنے لگی۔ مجھے یوں لگا جیسے ''بک شیلف'' کی شباہت مجروح ہو رہی ہو! میں نے جلدی سے کتاب کی بے ترتیبی کو پابہ ترتیب کیا۔ ایسے میں مجھے خیال آیا کہ کیا بک شیلف اتنا حساس ہے کہ ایک کتاب کی معمولی سی بے ترتیبی اس کے خدوخال کو متاثر کر سکتی ہے اور اس کی ہیئت پر اثر انداز ہو سکتی ہے۔ میں وہیں کھڑے کھڑے بک شیلف کو دیکھنے لگا۔ کتابیں پڑھ کر جو بوریت مجھ پر طاری ہو گئی تھی، بک شیلف کو اس طرح گھورنے سے آہستہ آہستہ گھٹنے لگی۔ مجھے یوں لگا جیسے میں بک شیلف کو ''دیکھ'' نہیں رہا بلکہ ''پڑھ'' رہا ہوں۔ کسی ایسی دلچسپ کتاب کی طرح جس کے صفحات میں اندر کے جہانِ معنی کی ہزار ہاتہیں میرا راستہ روک رہی ہوں! ''بک شیلف'' جب میرے لیے ''کتاب گاہ'' کی بجائے مجسم کتاب کی صورت اختیار کر گیا تو میری بے قراری اور بوریت یک لخت ہَوا ہو گئی۔ میں

تروتازہ ہوکر پوری تن دہی سے بُک شیلف کا مطالعہ کرنے لگا۔

مسلمانوں نے اپنے زرّیں دور میں، ادب، سائنس، فقہ، طب اور کئی دوسرے علوم پر بڑی گراں مایہ کُتب تخلیق کی تھیں لیکن جب صلیبی جنگوں کے طویل وقفے کے بعد ان کی نگاہ جوہر شناس دوبارہ فعال ہوئی تو سب سے پہلے جس قیمتی چیز سے وہ متعارف ہوئی وہ یہی ذخیرۂ کُتب تھا۔ آج بھی علم وحکمت کے وہ گراں بہا موتی جو مُسلم علما کی فکری جد و جہد کا ثمر تھے، یورپ کی لائبریریوں کی زینت ہیں۔ حملہ آوروں نے ان کُتب پر تو آتے ہی قبضہ کر لیا تھا مگر ستم بالائے ستم یہ کہ جاتے جاتے انھوں نے وہ الماریاں، کُتب گاہیں اور بُک شیلف بھی نذرِ آتش کر دیے جو ان کتابوں کو ذخیرہ کرنے کے لیے استعمال کے جاتے تھے۔ شاید وہ، الماریوں بُک شیلفوں کی اس مخفی قوت سے آگاہ تھے کہ اگر یہ باقی رہے تو کسی نہ کسی دور میں پھر کتابوں سے لبالب بھر جائیں گے۔ کیوں کہ بُک شیلف مصنف یا محقق کے لیے ایک محرّک کی طرح ہوتا ہے جو اُسے کتاب تصنیف یا تخلیق کرنے پر مجبور کر دیتا ہے۔

بہت سے احباب الماری اور بُک شیلف کو ایک ہی نظر سے دیکھتے ہیں لیکن میرے خیال میں الماری اور بُک شیلف میں دو بڑے اور نمایاں فرق ہیں پہلا فرق ساخت کے اعتبار سے ہے جب کہ دوسرا حیثیت اور استعمال کے حوالے سے۔ الماری دراصل سالخوردہ لکڑی کا ایک ایسا بند ڈبا ہے جس کے سامنے والے رُخ پر بھیانک جبڑوں جیسے دو پَٹ نصب ہوتے ہیں جن پر بوقتِ ضرورت جبر کی زنجیر بھی لگائی جا سکتی ہے۔ اس کے اندر رکھی ہوئی کتابیں دَم سادھے، پَٹ کھلنے اور کھولنے والے کی ہمہ وقت منتظر رہتی ہیں تا کہ اس حبس زدہ ماحول سے نکل کر کھلی فضا میں جی کھول کر سانس لے سکیں۔ دوسری طرف بُک شیلف کتابوں کو کسی قیمتی تصویر کی طرح اپنے منقّش فریم میں سجائے ہوئے ہوتا ہے۔ اس کی چار دیواری میں حبس اور جبر کا قطعاً کوئی احساس نہیں ہوتا۔ بُک شیلف میں رکھی ہوئی کتابیں، الماری میں رکھی کُتب کی طرح محبوس نہیں ہوتی بلکہ مربوط ہوتیں۔ میرے نزدیک الماریاں، کتابوں کا ایسا ''بندی خانہ'' ہیں جس میں وہ لاچار قیدیوں کی طرح پڑی سڑنے پر مجبور ہوں، جب کہ بُک شیلف میں سلیقے سے لگی ہوئی کُتب، کھلنڈرے بچوں کی طرح چُہلیں کرتی محسوس ہوتی ہیں، اور کبھی ان کے رنگ برنگے گرد پوش کسی گلشن میں چپکے سے اُتر آنے والی بہار کا منظر پیش کرتے ہیں۔

بعض اوقات ایسے بُک شیلف بھی دیکھنے میں آتے ہیں، جو کتابوں کے ساتھ تعزیرات کی زد میں آ جانے والے ''ملزم'' کا سا سلوک کرتے ہیں۔ ہمارے ایک دوست الف۔ف کے گھر میں جو ''بُک شیلف'' ہے اس میں کتابیں کچھ اس طرح ''چُنی'' ہوئی نظر آتی ہیں کہ اس پر ڈسٹرکٹ جیل کا گمان

ہونے لگتا ہے۔ اس پر مستزاد یہ کہ موصوف نے کتابوں کے گرد پوش پر باہر کی طرف انتہائی جلی حروف میں نمبر لگا رکھے ہیں تا کہ ''فرار'' یا گم ہو جانے والی کا فوری نوٹس لیا جا سکے۔

پبلک لائبریریوں میں عوامی سہولت کے پیشِ نظر ریڈنگ رومز میں موجود شیلفیں کتابوں سے اَٹی ہوتی ہیں، مگران پر لگی ''حوالہ جاتی کتب'' کی قدغن کتابوں کے اس مہکتے لالہ زار کو بھی صحرا بنا ڈالتی ہے۔ میرے خیال میں تو لائبریری سے کتاب نکلوانا بھی کسی ملزم کو ضمانت پر رہا کروانے کے مترادف ہے، کیوں کہ ان دونوں عوامل میں وقوع پذیر ہونے والی کاغذی کارروائی میں گہری مماثلت ہے۔ ضمانت کروانے کی طرح بہت سی قانونی اور ضروری کارروائی خانہ پُری کے بعد ہی ہم کسی کتاب کو لائبریرین کی وضع کردہ طلسمی زنجیر سے آزاد کروانے میں کامیاب ہو پاتے ہیں۔

کبھی کبھی تو مجھے یہ ساری کائنات کسی ایسے بک شیلف کی طرح نظر آتی ہے جس میں انسانوں کا رُوپ دھارے، انتہائی دلچسپ اور حیران کر دینے والی اَن گنت کتابیں سلیقے سے ایستادہ ہوں، بعض لوگ بھی بک شیلف کی طرح ہوتے ہیں کھلے کھلے، دشمنی تو واضح دشمنی اور دوستی تو ڈنکے کی چوٹ پر دوستی کرنے والے، واشگاف رویے اور واضح خدوخال کے حامل یہ لوگ جو کچھ اندر سے ہوتے ہیں باہر سے بھی ویسے ہی دکھائی دیتے ہیں، جب کہ کچھ لوگ بند الماریوں کی طرح ہوتے ہیں جن کے پَٹ مقفل ہوں بلکہ بعض اوقات تو ان پر باقاعدہ شیشے کا خول منڈھا ہوا محسوس ہوتا ہے۔ ایسے لوگ بہت پُراسرار ہوتے ہیں اور کبھی کبھی خطرناک بھی ثابت ہو سکتے ہیں۔

انسان کا اپنا دماغ بھی تو بک شیلف کی طرح ہے جس میں واقعات اور یادداشتیں کتابوں کی طرح محفوظ اور مربوط ہیں۔ دوستوں یاروں کی عنایات اور شکایات پر مشتمل سرگزشتیں، افرادِ خانہ کے مسائل کی داستانِ ہفت رنگ، واجب الادا قرضوں کی تفصیلات پر مبنی بہی کھاتے اور مستقبلِ قریب کے لیے ممکنہ قرض دہندگان کے ایڈریسوں سے مرصع ڈائریاں انسان کے دماغی بک شیلف میں ہمہ وقت نہایت قرینے سے موجود رہتی ہیں۔ جب ضرورت پڑی مطلوبہ کتاب نکالی اور پڑھ لی، اب تو حضرتِ انسان نے اپنی ذہانت اور فہم و شعور کی مدد سے ایک نیا اور عجیب طرز کا بک شیلف ایجاد کر لیا ہے۔ اس میں دُنیا جہان کی معلومات، ہزاروں لاکھوں کُتب اور بے شمار دستاویزات کو محفوظ کرنے اور بوقتِ ضرورت دستیاب ہونے کی گنجائش رکھی گئی ہے۔ اگرچہ لوگ اُسے کمپیوٹر کہتے ہیں لیکن میرا دل اسے بھی بک شیلف ہی کہنا چاہتا ہے۔ اُمید ہے کمپیوٹر کو اس پر کوئی اعتراض نہ ہوگا۔

بصیر رضا

تعاقب

پہلے میں یہ سمجھتا تھا کہ خوشیوں کے تعاقب میں ہوں اور میری ان تک رسائی نہیں ہو رہی لیکن ایک روز اچانک مجھ پر انکشاف ہوا کہ دراصل خوشیاں مجھے ڈھونڈ رہی ہیں اور میں انھیں مل نہیں رہا۔

میرے گھر خوشی کی ہمیشہ میری غیر موجودگی ہی میں آتی ہے۔ اور جب تک میں گھر لوٹتا ہوں، اس وقت تک میرے گھر والے اس خبر میں موجود مسرت کا بہت سارس کشید کر چکے ہوتے ہیں اور مجھ تک وہ خبر ہزار خدشات اور وساوس میں لپٹی ہوئی پہنچتی ہے۔ یوں مجھ تک کسی خوشی کی خبر کا پہنچنا، نہ پہنچنے کے برابر ہوتا ہے۔ مجھے تو یوں لگتا ہے کہ میری غیر موجودگی میں کوئی اچھی خبر مجھ سے ملنے آئی تھی اور مجھے گھر میں موجود نہ پا کر مایوس ہو کر واپس چلی گئی۔ اور جب ''خوشیاں'' میرے گھر کے ارد گرد میری تلاش میں سرگرم عمل ہوتی ہیں تب میں اپنے کمرے میں بند ہو کر بڑے انہماک سے کسی فضول سی کتاب کا مطالعہ کرنے میں مصروف ہو جاتا ہوں۔ حتیٰ کہ وہ ساری خوشیاں مجھے نہ پا کر کسی نامعلوم سمت کو روانہ ہو جاتی ہیں۔ ان کے چلے جانے کے بعد میں بغیر کسی وجہ کے گھر سے باہر آ جاتا ہوں۔ فضا میں ان خوشیوں کی مہک ابھی تک موجود ہوتی ہے۔ جو مجھے شدید احساس زیاں میں مبتلا کر دیتی ہے۔ اور میں یہ روایتی جملہ کہہ کر اپنے آپ کو تسلی دینے کی ناکام کوشش کرتا ہوں کہ ''شاید میری بہتری اسی میں تھی۔''

میں اب اس نتیجے پر پہنچ چکا ہوں کہ اپنی خوش بختیوں کا تعاقب نہیں کر رہا بلکہ خوش بختیاں میرے تعاقب میں سرگرداں ہیں۔ لیکن بے شمار انسان ابھی تک یہ نہیں سمجھ پائے کہ وہ کسی کے تعاقب میں ہیں یا کوئی ان کا تعاقب کر رہا ہے۔ انسانوں کی بات تو الگ رہی، جملہ کائناتی مظاہر بھی شاید اس حقیقت سے آگاہ نہیں ہو سکے، آیا وہ کسی کو تلاش کر رہے ہیں یا کوئی اُن کی تلاش میں ہے۔ قدرت نے تعاقب کا یہ کھیل کچھ اس طرح سے رچا رکھا ہے کہ فاعل اپنی فعالیت اور مفعول اپنی مفعولیت سے بالکل بے خبر ہے۔ چور اور سپاہی کے اس کھیل میں کچھ پتا ہی نہیں چلتا کہ سپاہی، چور کے پیچھے ہے یا چور سپاہی کا تعاقب کر رہا ہے۔ البتہ بعض دفعہ چور اور سپاہی دونوں، ہاتھوں میں ہاتھ دیے کسی ایسے شخص کو ڈھونڈنے میں مصروف نظر آتے ہیں جو نہ چور ہے نہ سپاہی۔ چور کو اس پر سپاہی ہونے کا شبہ ہوتا ہے اور سپاہی کو

چور کا۔ لیکن جب اُنھیں وہ شخص مل جاتا ہے تو یہ دیکھ کر دونوں کو مایوسی ہوتی ہے کہ اس طرح اُن کی ملاقات خود اپنے آپ سے ہوگئی ہے، اور خود سے ملنا اُنھیں کسی صورت بھی گوارا نہیں ہوتا۔

تعاقب کا یہ کھیل اس وقت مزید دلچسپ ہو جاتا ہے جب اس کے مرکزی کردار عورت اور مرد ہوں۔ اس کھیل میں بھاگ دوڑ سے لے کر مار دھاڑ تک حاضرین اور قارئین کی دلچسپی کی ہر شے موجود ہوتی ہے۔ یعنی رنگ بھی، خوشبو بھی، شعلہ بھی شبنم بھی۔ محبت اور محبت سے زیادہ نفرت، عشق کی بے اجرت مزدوری کے مناظر بھی ہوتے ہیں اور حسن کو حاصل بے جا مراعات کی نمائش بھی۔

ہم سب، ہر صبح اپنے گھروں سے خوشیوں کی تلاش میں نکلتے ہیں اور ناکام و نامراد لوٹتے ہیں۔ کیا واقعی ایسا ہے کہ ہم کبھی اپنے لیے خوشیاں ڈھونڈ کر لانے میں کامیاب نہیں ہوئے! میرے خیال میں ایسا نہیں ہے۔ متعدد بار یہ خوشیاں ہمارے ہاتھ لگ جاتی ہیں لیکن ہماری تشفی اس لیے نہیں ہوتی کہ ان خوشیوں کے حصول کے لیے ہماری خواہش میں جتنی شدت اور جذبات میں جتنی حدت ہوتی ہے، یہ ''خوشیاں'' اتنی ہی سرد اور مدھم ہوتی ہیں۔ چناں چہ ہم اس شک میں مبتلا ہو جاتے ہیں کہ ہمیں حاصل ہونے والی اس چڑیا کا نام خوشی ہے بھی یا نہیں! بالآخر اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ یہ خوشی نہیں ہو سکتی کیوں کہ اس کی شکل تو اُس تصویر سے بالکل مختلف ہے جو ہمارے دل میں ہے اور جسے ہم دنیا بھر کے بازاروں، ہوائی اڈوں، ریلوے اسٹیشنوں اور بس اسٹاپوں پر لیے لیے پھرتے ہیں، مگر اس طرح کا کوئی چہرہ نظر نواز نہیں ہوتا۔

ہم انسانوں نے جب سے اس زمین کو اپنا مسکن بنایا ہے، تب سے ہم لاتعداد مرتبہ کاندھے پر تیر و کمان سجائے اور ہاتھ میں تلوار لیے اپنے اپنے گھر سے اس امید پر نکلتے رہے ہیں کہ ''خوشی'' شاید کسی ظالم دیو کی قید میں ہوگی، اور نہ جانے کتنے برسوں سے کسی شہزادے کی منتظر ہوگی کہ آئے اور اُسے ظالم دیو کے پنجے سے آزاد کروائے۔ لیکن جب ہم اُس کی مدد کے لیے ظالم دیو کی طلسماتی سلطنت میں پہنچتے ہیں تو دیکھتے ہیں کہ خوشی، دیو کے قبضے میں ضرور ہے لیکن اُسے ہم ایسے کسی شہزادے کا انتظار نہیں۔ وہ دراصل ظالم دیو کے نکاح میں آچکی ہوتی ہے اور نکاح میں اُس کی مرضی بلکہ ضد بھی شامل ہوتی ہے۔ ہمیں وہ شہزادہ نہیں بلکہ ایسا وِلن سمجھتی ہے جو اس کی خوشحال گھریلو زندگی میں زہر گھولنے آ گیا ہو۔

ہم لوگ کسی کا پیچھا کرنے اور کسی سے پیچھا چھڑانے کی عادتِ بد کے اس درجہ اسیر ہو چکے ہیں کہ ''ستائش کی تمنا اور صلے کی پروا'' کیے بغیر ہی یہ دونوں کام جاری رکھے ہوئے ہیں۔ اپنا پیچھا کرنے والی نیک بخت کے جذبات کا احترام کرنا خود سے پیچھا چھڑانے والی بد بخت رائے کو تسلیم کرنا ہمیں کسی

طور منظور نہیں۔ کیوں کہ ان دونوں صورتوں میں کہانی پن، زائل ہو جانے کا خدشہ ہے۔ ساتھ ہی ساتھ آرٹ کی لطافت میں اخلاقیات کی کثافت کے در آنے کا امکان بھی ہے اور ہم اپنی کہانی کو اتنی آسانی سے فلاپ ہوتے نہیں دیکھ سکتے۔

ہم انسانوں کے درمیان اگر کوئی حقیقی رشتہ ہے تو صرف جدائی کا! باقی تمام رشتے فرضی ہیں۔ جدائی کے اس رشتے کو دنیا کی کوئی طاقت توڑ نہیں سکتی بلکہ توڑنے میں دلچسپی ہی نہیں لیتی۔ اس رشتے نے ہمیں تعاقب کی ڈور میں پرو دیا ہے۔ ہمارا تعلق زندگی کی خواہ کسی بھی انجمن سے ہو، ہم پر کسی نہ کسی کا تعاقب کرنا لازم ہے۔ بیویاں گھر کی کھڑکیوں، تعویذ دھاگوں، بڑی بوڑھیوں کی نصیحتوں اور سہیلیوں کی مشاورتوں کے ذریعے اپنے خاوندوں کا تعاقب کرنے میں مصروف رہتی ہیں۔ عاشق، اپنے محبوب کی ایک ایک ساعت کی خبر رکھنے کے لیے، ہر وہ حربہ آزماتے ہیں جس میں جان اور عزت دونوں کے بیک وقت چھن جانے کا سو فیصد احتمال ہوتا ہے۔ صحافی، خبر کے پیچھے مارا مار پھرتے ہیں اور خبر اُن کے قریب ہی کہیں کسی شے کی اوٹ میں چھپے اُن کے سراسیمگی کو دیکھ دیکھ کر محظوظ ہو رہی ہوتی ہے۔ جاسوس، کو ہر اُس آدمی کا تعاقب کرنا ہوتا ہے جس کی شکل میں قدرت نے قاتلوں کی سی ہر خوبی شامل کر دی ہو۔ لکھاری، لفظوں کے تعاقب میں سرگرداں رہتے ہیں اور شکاری، شکار کا پتا پوچھتے پھرتے ہیں۔

تعاقب کا عمل دورِ جدید میں اتنی وسعت اختیار کر گیا ہے کہ ہم اس کو زیادہ موثر بنانے کے لیے اسے مختلف شعبوں میں بانٹنے پر مجبور ہیں۔ تعاقب کا ایک بدنام زمانہ شعبہ وہ ہے جس میں ہم اپنے دشمنوں اور مخالفوں کا تعاقب اس لیے کرتے ہیں کہ دشمنی اور مخالفت میں جو کسر باقی رہ گئی ہے، وہ بھی پوری ہو جائے۔ دوسرا اہم شعبہ وہ ہے، جس میں ہر نوجوان اپنی نوجوانی کا ثبوت مہیا کرنے کے لیے کسی نہ کسی پری جمال کا تعاقب کرنے کی کوشش کرتا ہے، اور مقصود اس تعاقب کا فقط یہ ہوتا ہے کہ اس پری جمال کے حسن کے دیگر پہلوؤں کا بھی احاطہ کیا جائے جس کی اوّلین ادا نے اُسے دین سے غافل اور دنیا کی طرف مائل کر دیا تھا۔ لیکن ایسے تعاقب کا نتیجہ اس لیے مایوس کن ہوتا ہے کہ حسن کے دیگر پہلوؤں تک رسائی کے ساتھ ساتھ زیرِ سطح موجود بدصورتی سے بھی مڈ، بھیڑ ہو جاتی ہے اور حسن کے احساس کی وہ لذت ختم ہو جاتی ہے جو کہ پہلی ملاقات کا ثمر ہوتی ہے۔ اس لیے ہمیں چاہیے کہ جب تک ہم نوجوان ہیں تب تک عشق کے عمل کو پہلی ملاقات تک ہی محدود رکھیں کیوں کہ عشق میں اگر کسی شے کو اہمیت حاصل ہے تو وہ محبوب سے پہلی ملاقات ہے، اس کے بعد تو صرف جدائی ہی سے عشق کی توانائی برقرار رہ سکتی ہے۔

محمد عامر رانا

لوری

بچپن میں سُنی ہوئی لوریاں اب بھی کبھی کبھار مجھے اپنی گرفت میں لے لیتی ہیں۔ان کا تصور اتنا جانفزا ہوتا ہے کہ لگتا ہے جیسے راحت دھیرے دھیرے وجود میں گھل مل رہی ہو اور سوچوں کا ایک دریچہ بچپن کی طرف کھل گیا ہو۔بچپن کی شرارتیں،معصومیت اور واقعات یاد آنے لگتے ہیں۔اور پھر یادوں کا یہ سلسلہ طویل سے طویل تر ہوتا جاتا ہے۔لوری تو بس بچپن کی یادوں۔۔۔۔کو روشن کرنے والے بٹن کا کام دیتی ہے۔ایسے لمحات میں میری شدید خواہش ہوتی ہے کہ ماں کی آغوش میں سر رکھ کر معصومیت سے کہوں ''امی لوری سناؤ نا۔'' لیکن لوریاں تو میری بہنوں میں تقسیم ہو چکی ہیں۔پھر میں یہ کرتا ہوں کہ ماں کے قدموں میں بیٹھ جاتا ہوں' ہولے ہولے پاؤں دباتا جاتا ہوں اور پھر دُنیا بھر کی باتیں چھیڑ دیتا ہوں' اور ماں کی باتوں سے لوری کا حظ کشید کرتا ہوں،اور واقعی ماں کی میٹھی باتوں سے لوری کی خوشبو اور مٹھاس پھوٹتی ہے۔شاید لوری میں اس کے الفاظ کا ترنم اور آہنگ میں کوئی مسرت اور راحت پوشیدہ نہیں ہوتی بلکہ ماں کی ممتا اسے پُر تاثیر بناتی ہے۔اگر ایسا نہ ہوتا تو پھر ہم فلمی لوریوں سے بھی اُسی طرح لطف اندوز ہوتے جس طرح ماں کی سنائی ہوئی لوری سے۔سچی بات ہے کہ فلمی اور دیگر گائی ہوئی لوریاں مجھ پر آج تک وہ تاثر قائم نہیں کر سکیں،جو ماں کے سادہ مگر مسرت انگیز الفاظ مجھ پر طاری کر دیتے تھے۔شاید فلمی لوریوں میں محبت کی گھلاوٹ نہیں ہوتی۔

مجھے لوری سننے کی اپنی عادت عجیب سی لگتی ہے مگر پھر یہ سوچ کر مطمئن ہو جاتا ہوں کہ لوری سننے کا تعلق کسی خاص عمر کے ساتھ نہیں ہے۔اس کی ضرورت تو ہمیں ہر اس لمحہ پڑتی ہے جب محبت کی ناطمانیت اپنے آپ کو کھول دیتی ہے۔یہ اور بات کہ اس طلب کو ہم کن کن ذرائع سے پورا کرنے کی کوشش کرتے ہیں،لیکن یہ طے ہے کہ ماں لوری کے ذریعے ہمارے اندر محبت کی آبیاری کرتی ہے بلکہ میں تو یہ کہتا ہوں کہ لوری محض بہلاوا نہیں ہے،جس سے ماں بچے کو سُلانا چاہتی ہے بلکہ یہ تو امرت ہے، جس کا پہلا ٹیکا ماں ہمارے کانوں میں اس وقت ڈالتی ہے،جب ہم خواب دیکھنے سے پہلے کرب میں

مبتلا ہوتے ہیں اور لوری ہمیں اس کرب سے آزاد کر کے چندا ماموں اور رنگ برنگی پریوں کے خوش کُن خوابوں سے ہم کنار کرتی ہے۔

لوری خوابوں کے دروازے کی چابی ہے۔اس چابی کے گھماتے ہی خوابوں کا دروازہ کھل جاتا ہے اور اس دروازے سے گزر کر ہم ایک اور ہی جہان میں پہنچ جاتے ہیں۔ ایک ایسا خوبصورت جہان، جہاں جاگت میں دیکھے خوابوں کی تعبیریں ہمیں اپنی گرفت میں لے لیتی ہیں۔ دراصل ایسے سندر خواب ہی گہری اور پُر سکون نیند کی ضمانت ہوتے ہیں۔ بلکہ میں تو کہتا ہوں کہ جسے نیند نہ آتی ہو، اُسے نیند آور گولیاں کھانے کے بجائے سوتے وقت بس ایک لوری سُن لینی چاہیے، پھر دیکھیے کیا ہوتا ہے۔

کبھی کبھی میں سوچتا ہوں کہ شاعری کا آغاز شاید لوری سے ہی ہوا تھا، جب ماں نے پہلی بار اپنے بلکتے ہوئے بچے کو سینے سے چمٹا کر، تھپکی دے کر بے ربط اور بے مفہوم الفاظ ایک میٹھے مترنم انداز میں ادا کیے ہوں گے تو وہ لوری بن گئے ہوں گے۔ گویا لوری ادب کی پہلی صنف ہے۔ پھر اسی سے گیت نے جنم لیا۔ گیت دھرتی کا نغمہ ہے، اور دھرتی نے ماں سے ہی اپنا تعارف پایا ہے۔ اور گیت ماں کو خوش کرنے اور اس سے اپنی محبت کے اظہار کا اعلامیہ ہے۔ بعد ازاں لوری کے بطن سے اور دوسری اصنافِ شعر نے جنم لیا۔ غور کیجیے کیا پرندوں کی تمام خوبصورت بولیاں، اور پھولوں کی ہلکی ہلکی سرسراہٹ زمین کی لوری نہیں لگتی ہے۔ جو سرِ شام، رات کو تھپک تھپک کر سلاتی ہے۔ لوری تو وہ مہربان پری ہے جو نیند کے آبِ حیات کی تلاش میں سرگرداں لوگوں کو ایک ایسی انگوٹھی عطا کرتی ہے، جس کے رگڑنے سے راستے کی تمام رکاوٹیں دُور ہو جاتی ہیں۔

لیکن آج لوری بقا کی جنگ ہارتی ہوئی محسوس ہوتی ہے۔ جس طرح آج کے بچے، بچپن کی کہانیوں سے محروم ہو چکے ہیں، لگتا ہے وہ وقت اب زیادہ دُور نہیں، جب وہ لوری سے بھی محروم ہو جائیں گے۔ اگر ایسا ہوا تو یہ جدید دور کا بہت بڑا سانحہ ہوگا شاید ایٹم بم کے دھماکے سے بھی بڑا سانحہ! محبت، ماںتا اور لوری تو ایک مثلث ہے۔ اگر اس کا ایک رکن بھی کم ہو گیا تو یہ کیسے قائم رہے گی، ناممکن ہے کہ ٹی وی اور آڈیو کیسٹیں اس کی جگہ لے سکیں۔ یہ مشینی آلات وہ خلوص اور محبت تو بچے کو نہیں دے سکتے، جو ماں کی لوری اسے دے سکتی ہے، پھر ایک اور خطرناک رجحان بھی پرورش پا رہا ہے کہ بچے کو جن یا بلی سے ڈرا کر سُلانے کی کوشش کی جاتی ہے۔ اس سے بچے کو خوف کے سوا کچھ نہیں ملتا۔

مجھے لوری کے گم ہونے کے تصور ہی سے ہول آتا ہے۔ چناں چہ میں ایسے لمحوں میں اپنی آنکھیں پوری طرح میچ لیتا ہوں۔ اور پھر وہی کرتا ہوں یعنی ماں کے پاؤں دبانے لگتا ہوں اور اُسے دُنیا بھر کی باتوں میں الجھا کر لوری کا حظ کشید کرتا ہوں۔ راحت آہستہ آہستہ وجود میں گھلنے لگتی ہے، اور پھر میں ہر طرح کے خوف سے آزاد ہو جاتا ہوں۔

☆☆☆☆

ڈاکٹر نعیم احمد

دائرہ

میرے ایک دوست ہیں مسٹر۔''ن''۔ بڑی پراسرار شخصیت کے مالک ہیں۔ایک دن میں ان سے ملنے ان کے گھر گیا تو وہ میرا بازو پکڑ کر گھر کی عقبی طرف لے گئے۔ یہاں ایک الگ تھلگ کمرا بنا ہوا تھا۔ انھوں نے کمرے کا دروازہ کھولا اندر داخل ہو گئے۔ کمرا بالکل خالی تھا۔فرش پر سفید رنگ سے بہت بڑا دائرہ کھینچا ہوا تھا۔ دائرے کے اندر ایک گدی اور پانی کی ایک بالٹی رکھی ہوئی تھی۔ میں حیران ہو کر ان کی طرف دیکھنے لگا۔ وہ مسکرائے اور دیوار کی طرف اشارہ کر کے بولے''ادھر دیکھو''میں نے دیوار کی طرف نظر اُٹھائی تو دیکھا کہ دیوار پر ایک نسبتاً چھوٹا دائرہ کھنچا ہوا تھا۔ساتھ ہی ایک طاقچہ تھا جس میں ایک پرانا چراغ رکھا تھا۔ طاقچہ کے اوپر دیوار کا کافی حصہ دھوئیں سے سیاہ ہو چکا تھا۔ میری حیرانی دیکھ کر وہ مسکراتے ہوئے دھیمے لہجے میں بولے''رات کو میں اس دائرے کے اندر بیٹھ کر وظیفہ کرتا ہوں۔شمع بینی کی کوشش کرتا ہوں اور ہپناٹزم کی استعداد بھی بڑھاتا ہوں۔آج کل میں تسخیر ہمزاد کا عمل کر رہا ہوں۔ عشا کے بعد میں حصار کے اندر بیٹھ جاتا ہوں۔ چراغ کی روشنی میں ساری رات ایسے ایسے مناظر دیکھتا ہوں کہ کمزور آدمی کا دم نکل جائے۔ عجیب وغریب ڈراونی شکلیں مجھ پر حملہ کرنے کے لیے بڑھتی ہیں اور مجھے حصار سے باہر نکالنے کی کوشش کرتی ہیں۔لیکن وہ دائرے کے اندر نہیں آسکتیں۔رات جب کبھی میں بے وضو ہو جاؤں تو فوراً بالٹی کے پانی سے وضو کر لیتا ہوں۔ابھی میرے وظیفے کے مکمل ہونے میں دو ہفتے باقی ہیں۔''انھوں نے کمرا مقفل کیا اور باتیں کرتے ہوئے مجھے واپس لے آئے۔

میں سائنس کا طالب علم ہوں۔ان باتوں پر یقین نہیں رکھتا۔لیکن اس روز''ن'' کے کمرے میں فرش پر کھینچا ہوا دائرہ دیکھ کر میرے ذہن میں کئی خیالات پیدا ہوئے اور اس دن سے میں دائرے کا تصور جاننے کی کوشش کر رہا ہوں۔''ن'' کے بارے میں میرا یہ خیال ہے کہ انھوں نے اپنی شخصیت اور وجود کے اندر کہیں ایک دائرہ کھینچا ہوا ہے جس میں وہ سمٹ کر بیٹھ جاتے ہیں۔ پھر تمام رات اپنے اندر کے عفریتوں کو اس دائرے میں داخل ہونے سے باز رکھتے ہیں۔ میں اکثر سوچتا ہوں کہ ازمنۂ قدیم میں

جب انسان نے ہوش سنبھالا ہوگا تو شاید جس تصور سے وہ شعوری یالاشعوری طور پر سب سے زیادہ متاثر ہوا ہوگا' وہ دائرے کا تصور ہی ہوگا۔ سورج روزانہ اس کے سامنے طلوع وغروب کا نصف دائرہ مکمل کرتا تھا۔ باقی نصف دائرے کا اندازہ انسان خود لگالیتا ہوگا۔ موسموں کا الٹ پھیر پودوں کا زمین سے اگنا' بار آور ہونا اور گل سڑ کے پھر زمین میں سما جانا' حیات کا ظہور ہونا پھر ظہور پذیر ہونا' یہ سارے اعمال لیے دائرہ در دائرہ گھوم رہے تھے۔ چناں چہ میرے خیال میں وقت کا اولین تصور جو قدیم انسان کے ذہن میں ابھرا ہوگا' دائروی ہوگا۔ میرے اس خیال کی تائید قدیم مصریوں کا یہ عقیدہ بھی کرتا ہے کہ مرنے کے بعد روح تحت الثریٰ میں چلی جاتی ہے اور ایک ہزار سال بعد اپنے جسم کی طرف پلٹتی ہے۔ روح کے اس دائروی تصور نے قدیم مصریوں میں علم حنوط کو فروغ دیا۔ اور اہرام مصر جیسے عظیم تمدنی مظہر کو وجود بخشا۔ جب میں ہندوؤں کے آواگون کے نظریہ پر غور کرتا ہوں تو یہ بھی مجھے روح کے اس دائروی تصور ہی کا غماز معلوم ہوتا ہے۔

نطشے کہتا ہے کہ جب ایک دفعہ وہ سلوا پلانا جھیل کے کنارے سیر کرتے ہوئے ایک بہت بڑی چٹان کے نیچے کچھ دیر کے لیے رکا تھا تو اس احساس نے اسے اپنی گرفت میں لے لیا تھا کہ ہر شے چلی جاتی ہے' ہر شے پلٹتی ہے۔ وجود کا پہیہ ابدی طور پر گھومتا رہتا ہے۔ ہر شے مرجاتی ہے' ہر شے پھر نمو پذیر ہوتی ہے۔ وجود کا سال ابداً جاری رہتا ہے۔ تمام اشیا ابدی طور پر مراجعت کرتی ہیں اور ہم خود بے شمار دفعہ پیدا ہو چکے ہیں۔ اور ہمارے ساتھ تمام اشیا بھی وجود پذیر ہو چکی ہیں۔ نطشے سمجھتا تھا کہ کائنات ایٹموں کی ایک معینہ تعداد سے عبارت ہے۔ یہ ایٹم مختلف تناسبات میں یکجا ہوتے ہیں' منتشر ہوتے ہیں اور پھر اپنی پرانی ترتیب قائم کر لیتے ہیں۔ اس طرح فوق البشر (Superman) بھی منصۂ وجود پر آتا ہے اور شان وشوکت سے حکومت کرنے کے بعد پردۂ وجود سے معدوم ہو جاتا ہے۔ لیکن ہزار سال گزرنے کے بعد پھر وہ وجود پذیر ہوتا ہے۔

کبھی کبھی مجھے یوں لگتا ہے جیسے کائنات کی آفرینش ہی ایک عظیم دائروی حرکت سے ہوئی تھی پھر اس کے اندر پیدا ہونے والے کرے خلا کی لامحدود وسعتوں میں مختلف دائروں کے اندر گردش کرنے لگے تھے۔ ان کے مدار لا تعداد نوعیتوں کے تھے۔ مگر تھے یہ سب کے سب دائرے۔ آج بھی رات کو میں آسمان پر پھیلی ہوئی کہکشاں کو دیکھتا ہوں تو مجھے یوں لگتا ہے جیسے وہ کسی لٹو کی طرح گھوم رہی ہو۔

کبھی آپ نے سوچا کہ دائرے سے بڑھ کر لامتناہیت اور ابدیت کی علامت اور کیا ہو سکتی ہے! خطِ مستقیم تو ابتدا اور انتہا کے تابع ہے۔ لیکن دائرے کا نقطۂ آغاز ہی اس کا نقطۂ انجام بھی ہے۔ آئن سٹائن کہتا ہے کہ اگر آپ جہاں کھڑے ہیں وہاں سے ایک شعاع خطِ مستقیم میں سفر شروع کرے تو ایک دن ساری کائنات کا چکر لگا کر پھر اسی جگہ آ جائے گی۔ اسی لیے وہ کائنات کو متناہی سمجھتا ہے اور اس کے دائروی ہونے کی وجہ سے اس کی پیمائش کرنے کا دعویٰ بھی کرتا ہے۔

انسانی زندگی پر جب میں غور کرتا ہوں تو یہ بھی مجھے دائرہ میں گھومتی ہوئی نظر آتی ہے۔ جس طرح ساکن پانی میں پتھر پھینکنے سے لاتعداد دائرے وجود میں آ جاتے ہیں اسی طرح ہماری زندگیوں میں مختلف معمولات دائرہ در دائرہ پھیلے ہوئے ہیں۔ یہ ایک عجیب بات ہے کہ آدمی معمولات کی یکسانی سے فرار بھی اختیار کرنا چاہتا ہے، لیکن معمولات کی گردش میں اسے اپنا تحفظ بھی نظر آتا ہے۔ زندگی کی یکسانیت سے فرار کبھی کبھار تو اچھا لگتا ہے، لیکن مستقل فرار اور گریز کی حالت میں رہا بھی نہیں جا سکتا۔ اس لیے ہم دن رات اپنے معمولات کے دائروں میں گردش کرتے رہتے ہیں اور اس میں اپنی عافیت سمجھتے ہیں۔

کبھی کبھی میرے ذہن میں یہ سوال بھی پیدا ہوتا ہے کہ دائرے میں گردش کرنے کو تقدس کیوں حاصل ہے؟ کیا اس لیے کہ دائرے میں گردش کمال مطلق کی علامت ہے؟ کیا اس لیے کہ یہ ایک ناقابل شکست ازدواجی بندھن کو وجود میں لاتا ہے؟ لیکن ساتھ ہی میں یہ بھی سوچتا ہوں کہ دائروی گردش کو کتنا ہی تقدس اور عظمت حاصل ہو جائے کیا یہ ایک سعیِ لاحاصل نہیں رہے گی؟ آپ پوچھیں گے کیوں تو اس کے جواب میں آپ کو ایک پرانی حکایت کا حوالہ دوں گا۔ کہتے ہیں کہ پرانے زمانے میں ایک بادشاہ تھا جسے کہانیاں سننے کا بہت شوق تھا دور دور سے داستان گو اسے کہانیاں سنانے آتے۔ کہانی جب اپنے اختتام کو پہنچتی تو بادشاہ مطالبہ کرتا کہ کہانی کو طول دیا جائے۔ لیکن کہانی تو بہرحال ختم ہو جاتی تھی۔ بادشاہ کی فرمائش تھی کہ اسے ایسی کہانی سنائی جائے جس کا کبھی اختتام نہ ہو۔ بادشاہ کی یہ فرمائش پوری کرنے سے بڑے بڑے داستان گو عاجز آ گئے۔ آخر ایک دن ایک داستان گو نے یہ دعویٰ کیا کہ بادشاہ کو ایسی کہانی سنائے گا کہ کبھی ختم نہ ہوگی۔ اس نے بادشاہ کو کہانی سناتے ہوئے کہا۔ ''۔۔۔ پھر اس شخص نے ایک بہت بڑا گودام تعمیر کروایا اور گودام میں چاول بھر دیے۔ پھر اسے بند کر دیا۔'' بادشاہ نے پوچھا ''پھر کیا ہوا؟'' داستان گو نے کہا ''لیکن گودام میں ایک سوراخ رہ گیا اور اس کا پتا ایک چڑیا کو چل

گیا۔ چناں چہ وہ سوراخ میں داخل ہوئی اور ایک دانہ لے گئی۔" بادشاہ نے پوچھا" پھر کیا ہوا؟" داستان گو نے کہا" چڑیا آئی اور ایک دانہ لے گئی!" بادشاہ نے پوچھا" پھر کیا ہوا؟" داستان گو کہتا رہا" چڑیا پھر آئی اور ایک دانہ لے گئی!"

سوچیے کہ اس داستان گو نے کس چالاکی سے بادشاہ کے فکر کو ایک دائرے میں قید کر دیا تھا۔ ویسے دائرے میں گھومنے والی دلیل یعنی وہ دلیل جو کہیں ختم نہ ہو، بہت بڑا منطقی مغالطہ کہلاتی ہے۔ ایسے سفر سے کیا حاصل جو سدا ایک دائرے میں جاری رہے؟ زندگی کے ان معمولات کا کیا فائدہ جو زندگی کی تگ و تاز کو مُڈ ڈ ر کھاڑیوں میں محبوس کر دیں۔

سو جناب! اگر آپ گھر کی دیواروں اور ذات کے حصاروں میں عافیت کی زندگی بسر کرنا چاہتے ہیں تو بے شک ایک ازلی و ابدی دائرے میں گھومتے چلے جائیں۔ لیکن اگر آپ کو اس کائنات کی سیر کرنا مطلوب ہے تو پھر کسی روز دائرے کو توڑ کر باہر آئیں۔ اور خطِ مستقیم پر سفر شروع کر دیں۔ میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ آپ واپس نہیں آئیں گے۔ آئن سٹائن بھی اگر اس طرح جاتا تو واپس نہ آتا۔ اسی لیے میں اس دائروی تصور کو گھر گرہستی کا تصور کہتا ہوں اس میں مجھے سدھارتھ کی جراٴت رندانہ نظر نہیں آتی۔

☆☆☆☆

جاوید حیدر جوئیہ

گنگنانا

کہتے ہیں سقراط جب زہر کا پیالہ پی چکا تو ایک شاگرد عزیز نے پوچھا: ''استاد! ہم آپ کی تجہیز و تکفین کس طرح کریں؟'' ''میری تجہیز و تکفین؟'' سقراط نے کہا'' کریٹو لگتا ہے تمھیں ابھی بہت کچھ سیکھنا ہے' یاد رکھو! لفظوں کا غلط استعمال دنیا کا سب سے بڑا گناہ ہے۔''

یہ واقعہ پڑھنے سے پہلے میں بھی ''گنگنانے'' کو محض ''گانے (Singing) کی ایک لطیف صورت ہی سمجھتا تھا' لیکن جوں جوں اس لفظ پر غور کرتا گیا' مجھ پر معنی اور مفہوم کی ایک نئی دنیا کے دروازے کھلتے گئے یہاں تک کہ میں نے اس لفظ کے ''غلط استعمال'' کے ''گناہ'' سے توبہ کر لی ہے' آپ یقین کیجیے مجھے اس توبہ کی مسرت ہی نے عملی طور پر گنگنانے پر مجبور کیا ہے۔

باقاعدہ ''گانا'' ایک مشکل عمل ہے جس کے لیے ایک طے شدہ' مرتب نظام اصوات اور افتاد طبع کے ساتھ ساتھ لحن' مشق اور ریاضت کی بھی ضرورت ہے۔ مگر گنگنانا ''باقاعدہ'' گانے کی ساری مشکل حل کر دیتا ہے۔ گنگنانا اکثر اوقات گانے کی پابندیوں کو رد کرتا ہے لیکن اتنا سخت جان ہے کہ اس کی صحت پر قطعاً کوئی اثر نہیں پڑتا۔ اسی آزادہ روی کی بدولت گنگنانا' گانے سے بڑی اور انوکھی نعمت ہے۔ یہ وہ انوکھا عمل ہے جو گانے کو دائرے میں آنے کی اجازت تو کبھی کبھار دے دیتا ہے مگر خود کبھی گانے کے دائرے میں داخل ہونا پسند نہیں کرتا۔ اسی لیے ہم گنگناتے گنگناتے گانے تو لگتے ہیں لیکن گاتے گاتے گنگنا نہیں سکتے۔

اس کا دوسرا راز یہ ہے کہ یہ عمل شعوری طور پر بھی انجام دیا جا سکتا ہے اور عمل معکوس کی طرح لاشعوری طور پر بھی سرزد ہو سکتا ہے۔ گنگنانے کے اس دوہرے پن سے انسانی ذہن کی ارفع ترین کارکردگی کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ اگر ہم چاہیں تو کوئی سنا سنایا گیت' نظم' مصرع یا ماہیا گنگنانے لگیں یعنی یہ گنگنانے کی شعوری صورت ہے۔ لیکن آپ نے دیکھا ہوگا کہ کسی مسئلہ پر غور کرتے ہوئے یا پھر کسی کام کی حسب منشا تکمیل کے بعد کچھ لوگ بے ارادہ گنگنانے لگتے ہیں۔

یہ گنگنانے کی لاشعوری صورت ہے۔ شعور کی حاکمیت میں لاشعور کی یہ بغاوت ہی گنگنانے کی عظمت ہے اور یہ بغاوت ہی ہمیں روایت شکنی اور نئے نئے اصوات کی تخلیق کا درس دیتی ہے۔ جس طرح ہمارا لاشعور مروجہ قوانین وضوابط کا صد فی صد پابند نہیں اسی طرح بے ارادہ گنگنانا بھی محض مستعمل اور متداول الفاظ کی ترتیب واظہار کو ضروری نہیں سمجھتا۔۔۔ہوں ہوں ہوں' ل لا لا لا وغیرہ دیکھیے ہم مہمل اور خود ساختہ آوازوں سے کس طرح سرشار ہو کر گنگنانے کی اہلیت رکھتے ہیں! کیا آپ نے کسی سدھائے ہوئے طوطے کو یوں گنگناتے ہوئے سنا ہے؟ مشکل ہی نہیں ناممکن ہے!

گنگنانا ہمیں ایک عجیب طرح کی آزادی سے آشنا کرتا ہے یعنی نہ تو ہمیں باقاعدہ شاعر بننا پڑتا ہے نہ ''ریاض'' کی تپسیا سے گزرنے کی ضرورت ہی پڑتی ہے۔ بے ارادہ گنگنانے والا شاعر نہ بھی ہو تو ''شاعر'' ہوتا ہے' موسیقی کی ابجد نہ جانتے ہوئے بھی ''موسیقار'' ہوتا ہے کیوں کہ وہ ''کلام'' کو موزوں کرنے اور ''دھن'' بنانے پر قادر جو ہوتا ہے۔ میری طرح آپ بھی نفی واثبات کے گنجلک مسئلے کو سمجھنا چاہیں تو گنگنانا اپنی عادت بنالیں۔

کون نہیں جانتا کہ فرض شعاری کا دروازہ طمانیت کی سرسبز وشاداب وادی میں کھلتا ہے۔ جہاں مسرت کے خودرو پھولوں کی بھینی بھینی خوشبو اس طرح پھیلی ہوتی ہے کہ انسان مسرور ہو کر بے اختیار گنگنانے لگتا ہے' یہی وجہ ہے کہ فرض شناس اور ذمہ دار لوگ گنگنانے کی نعمت سے مالا مال ہوتے ہیں۔ اس کے برعکس کام چور اور نکھٹو لوگ بے جا فراغت کے جنگل میں اندھوں کی طرح بھٹکتے رہتے ہیں اور گنگنانے کے ''مسرت زار'' میں کبھی نہیں پہنچ پاتے۔ اس لیے جب کوئی شخص گنگنا رہا ہو تو سمجھ لیجیے کہ وہ اپنے کام اور ماحول سے نہایت مطمئن اور خوش ہے' چاہے اس کی مصروفیات دوسروں کے مقابلے میں ہزار گنا زیادہ ہوں' بلکہ یہ مصروفیت اور کام کی لگن ہی تو اسے گنگنانے کی دولت فراہم کرتی ہے۔

گنگنانا ہم سے ایک مخصوص مزاج اور ماحول کا تقاضا کرتا ہے۔ طبیعت میں نرمی اور دھیرج ہو تو شانت اور مسکن فضا میں گنگنانے کا مکمل لطف حاصل ہوتا ہے۔ آپ نے بھی میری طرح کسی غصیلے' چڑچڑے اور تنک مزاج شخص کو گنگناتے ہوئے نہیں دیکھا ہوگا' اسی طرح شور وغل' اچھل کود' دھکم پیل اور نفسا نفسی کے ماحول میں گنگنانا ممکن نہیں۔

قوال اور پاپ سنگر اکثر جذباتی لوگ ہوتے ہیں جو جذبات میں اشتعال پیدا کرتے ہیں جب کہ گنگنانے والا کسی دوسرے سے مخاطب ہی بہت کم ہوتا ہے اور اکثر اوقات خود ہی سے باتیں کرتا

ہے'اس لیے کسی کے جذبات سے کھیلنا گنگنانے والے کے بس میں نہیں ہوتا۔ بھلا تقریر کی شعلہ بیانی اور جلوس کی نعرہ بازی گنگنا کر ممکن ہے؟ ہرگز نہیں۔ فی الحقیقت گنگنانا اپنے بھیتر کی آواز کو اس طرح باہر لانے کا نام ہے کہ جیسے ہلال' بدر ہونے میں چودہ روز لے' مگر پتا گرنے جتنا بھی شور نہ ہو! یہ لطیف عمل جب دوسروں کو اپنی گرفت میں لیتا ہے تو پاؤں میں زنجیر نہیں ڈالتا بلکہ دوسروں کے گرد ایک جادوئی کنڈل بنا دیتا ہے کہ وہ خود فراموشی سے خود آگاہی کی لذت کشید کرنے لگیں۔ کیا عبادت کا خشوع و خضوع اسی خود فراموشی سے خود آگاہی تک کے سفر کا دوسرا نام نہیں۔

ارتکاز دولت کی تگ و دو اور عدم تحفظ کے احساس نے جدید دور کے انسان کو اس قدر خوف زدہ اور خود غرض کر دیا ہے کہ اس کے اندر دریا ''خطرے کے نشان'' تک چڑھ گیا ہے۔ گنگنانا ہمیں یہ صلاحیت فراہم کرتا ہے کہ اس چڑھے دریا میں مناسب جگہ اور مناسب وقت پر شگاف ڈال دیں۔۔۔اس طرح کہ بند بھی نہ ٹوٹے اور زائد پانی ہولے ہولے باہر نکل کر اس ابال کو مسطح کر دے۔ ظاہر ہے کہ جو لوگ گنگنانے سے دور ہو جاتے ہیں' ان کے اندر کا یہ ابال باہر نہیں آتا بلکہ اندر ہی اندر بڑھتا رہتا ہے اور سیلاب کی صورت اختیار کر جاتا ہے اس طرح تخریب و فشار کا سبب بن کر شخصیت کو توڑ پھوڑ دیتا ہے۔

ہائی بلڈ پریشر' امراضِ قلب' ڈیپریشن اور بعض نفسیاتی بیماریاں ہمارے معاشرے میں اسی لیے سرعت کے ساتھ سرایت کرتی جا رہی ہیں کہ مشین کا شور اور مستقبل کی ''فکر'' ہمیں ایک پل کے لیے شانت اور بے فکر نہیں ہونے دیتی۔ یوں قناعت اور تحمل سے دور رہ کر کبھی مسرت کے گلاب نظر نہیں آتے اور نہ ہی ان کی خوشبو ہم تک پہنچتی ہے۔ جہاں جدید دور کے یہ ''تحائف'' ابھی نہیں پہنچے وہاں آج بھی لوگ آزاد پرندوں کی طرح چہکتے اور گنگناتے ہوئے اپنی زندگیوں سے مطمئن ہیں۔

شاید یہی وجہ ہے کہ میں بڑے شہروں کا رخ کم ہی کرتا ہوں۔ شور شرابہ' دھکم پیل' دھواں۔۔۔ میری تو سانس گھٹنے لگتی ہے! لیکن کوئی ضروری کام پڑ ہی جائے تو میری کوشش ہوتی ہے کہ جلد از جلد کسی عافیت کی جگہ پہنچ جاؤں۔ اول تو گھر لوٹنے کو ترجیح دیتا ہوں۔ اگر یہ ممکن نہ ہو تو کسی تفریحی پارک کی راہ لیتا ہوں' جہاں اونچے گھنے پیڑوں میں گنگناتے ہوئے پرندوں کی صدائیں روح کو تر و تازہ کر دیتی ہیں۔ اگر یہ ماحول بھی نہ مل سکے تو پھر میں ہوٹل میں قیام کے بجائے شہر کے مضافات میں کسی ایسے گاؤں کی تلاش میں نکل جاتا ہوں جہاں شاید وہ بوڑھے اور جوان ابھی' موجود ہیں جو بیلوں سے ہل چلاتے' درانتی

سے فصل کاٹتے، مویشیوں کو چارا ڈالتے اور کھیتوں کو پانی دیتے ہوئے بے اختیار گنگناتے جاتے ہیں!
میرا جی چاہتا ہے کہ ان باعمل لوگوں کی گنگناہٹ میں تحلیل ہو کر کھلی فضاؤں میں اڑنے لگوں اور یہ باتیں
بالکل بھول جاؤں کہ آج سٹاک مارکیٹ میں کیا کمی بیشی ہوئی! ڈالر چڑھ گیا کہ روپیہ پھسل گیا! بڑے کو
نوکری ملی یا نہیں اور چھوٹے کے لیے نئی موٹر سائیکل کیسے خریدوں وغیرہ۔

☆☆☆☆

مختار پارس

مرتا ہوں خامشی پر

یہ بات تو طے ہے کہ دو ٹانگوں پر چلنے والی مخلوق جسے حرفِ عام میں انسان کہا جاتا ہے ایک جذباتی مخلوق ہے۔ لیکن یہ بات طے نہیں ہے کہ یہ انسان اپنے جذبات کا اظہار کتنے طریقوں سے کرتا ہے۔ قدرت نے اسے دل کی بھڑاس نکالنے کے لیے اپنی طرف سے ہر ممکن سہولتیں دینے کی کوشش کی ہے لیکن جذبات کے اظہار کے تمام ذرائع انسان کے لیے ناکافی ثابت ہوتے ہیں۔ مثلاً عورتوں کو بولنے کے لیے جو منہ ودیعت کیا گیا ہے اس کا گھیراؤ زیادہ سے زیادہ چار سے پانچ انچ تک ہوسکتا ہے لیکن جس مقدار میں ان نازنینوں کو بولنے کی خواہش ہوتی ہے اس حساب سے چاہیے تھا کہ جہاں ان کا منہ ہے وہاں توپ کا دہانہ فٹ ہوتا۔ اسی طرح مسٹر ’ج‘ میرے دوست کو اللہ نے جذبات کے اظہار کے لیے قلم کی طاقت عطا فرمائی ہے۔ موصوف نے دائی اماں کے ہاتھوں میں آتے ہی محبوبہ کی شان میں شعر کہنا شروع کر دیے تھے۔ اب تک ان کے گھر والے ان کی شعری کاوشوں پر مشتمل کوئی چار من کے قریب ردّی بیچ چکے ہیں۔ عمر پچپن کے قریب ہو چلی ہے مگر کہتے ہیں کہ ابھی تک کوئی ایسا شعر نہیں سُوجھ پایا جو محبوبہ کے خدوخال کی پوری پوری عکاسی کرتا ہو۔ مجھے سمجھ نہیں آتی کہ وہ اس محترمہ کی ایک تصویر ہی کیوں نہیں اتروا لیتے۔ اسی طرح کی ایک اور مثال آنکھوں کی ہے۔ انسان ان آنکھوں سے دیکھتا کم ہے اور روتا زیادہ ہے۔ اس دُنیا میں انسان کی ماتم کنائیاں محسوس کر کے یہ احساس ہوتا ہے کہ ماتھے کی دیواروں پر سجے یہ دو چھوٹے چھوٹے سے روزن رونے کا کام انجام دینے کے لیے انتہائی ناکافی ہیں۔ رونے کا کام آنکھ سے زیادہ ناک سے لیا جانا چاہیے تھا جو کہ ہر وقت بہتی رہتی ہے۔ اور اگر اللہ انسان کو ہاتھی جیسی ناک عطا کر دیتا تو اللہ کے خزانوں میں کونسی کمی واقع ہو جانا تھی۔ اس سے اتنا تو ہوتا کہ انسان ناک کے ذریعے ذرا کھل کھلا کر رو لیتا اور اپنے جذبات کا مکمل اظہار کر سکتا۔

اب چوں کہ انسان کو اپنی موجودہ شکل میں ہی گزارا کرنا ہے اس لیے میرا یہ خیال ہے کہ جذبوں کے اظہار کا سب سے مناسب طریقہ خاموشی ہے۔ نہ منہ کا آتش فشاں کھول کر الفاظ کا لاوا باہر

اُگلنے کی ضرورت اور نہ قلم کو کاغذی زمین پر ہل چلانے کی مشقت۔ نہ تو اس میں ''محنتِ قہقہہ'' درکار ہے اور نہ ہی زحمت احتجاج و غم۔ نہ تو اس کو سمجھنے کے لیے ہمہ تن گوش ہو کر بیٹھنا پڑتا ہے اور نہ اس کو سمجھ نہ پانے کا خطرہ ہی لاحق ہوتا ہے۔ خاموشی ایک عالمگیر ذریعۂ اظہار ہے جو اذنِ گویائی کا محتاج نہیں ہوتا۔ باقی سب ذرائع تو گداگر ہوتے ہیں جو صدا پر صدا دیے چلے جاتے ہیں تاکہ لوگ ان کی اپاہج مشقت سے متاثر ہو کر ان کے کشکولوں میں توجہ کے چند سکے ڈال دیں۔ مگر خاموشی ایک ایسا سحر ہے جس کی حقیقت پلک جھپکنے میں دلوں کے اندر جا کر خیمہ زن ہو جاتی ہے۔

یہ بات مجھے کسی راہ چلتے نے نہیں سمجھائی بلکہ میں نے زندگی کے خشک لیموں کو نچوڑ کر یہ عرق نکالا ہے۔ جب میں پیدا ہوا تھا تو اتفاق سے مجھے اس دُنیا کا کوئی خاص تجربہ نہیں تھا۔ میں سمجھتا تھا کہ دُنیا والے بھی ماں کی طرح رونے پر ہر مطالبہ اور ہر بات مان جاتے ہیں۔ ماں کی گود سے نکلا تو یہ بات سمجھ میں آئی کہ شور مچانے سے دُنیا کا کوئی مسئلہ حل نہیں ہوتا۔ تاریخ گواہ ہے کہ جن لوگوں نے گوتم کی طرح چُپ سادھی عوام نے انھیں زبردستی اپنا پیر و مرشد مان لیا اور جنھوں نے ہٹلر کی طرح 'ہاں ہاں' کی ان کا ٹینٹوا دبا کر خاموش کر دیا گیا۔ ہٹلر تو ویسے بھی کچھ زیادہ ہی بولتا تھا' شاید اسی لیے اس نے اپنا ٹینٹوا دبانے کا مقدس فریضہ خود ہی انجام دیا تھا۔ مابدولت نے بھی اپنی نادانی کے دنوں میں ایک دو موقعوں پر اپنی زور بیانی کا سہارا لے کر لوگوں کو اپنا نقطۂ نظر سمجھانے کی کوشش کی تھی۔ پہلی بار یہ کردار ہم نے ایک سیاسی بحث کے دوران میں ادا کیا تھا اور دوسری بار ہم اس لمحۂ پُر فریب میں بولے تھے، جب ہم نے کسی سے اظہارِ محبت کیا تھا۔ اوّل الذکر واقعے کے نتیجے میں ہمیں صرف گالیاں سماعت کرنا پڑتی تھیں جب کہ دوسرے واقعے کے نتیجے میں ہماری خاطر خواہ عزت افزائی بھی کی گئی تھی جس کا ہم یہاں تذکرہ ضروری نہیں سمجھتے۔ اس کے بعد ہم نے چُپ رہنے کی پالیسی پر عمل درآمد شروع کیا۔ اب اگر ہم نے کبھی کچھ کہنا بھی ہو تو وہی بات کسی دوسرے منہ سے کہلوا دیتے ہیں اور پھر اپنی خاموشی سے اس بات کی تائید بھی کر دیتے ہیں۔ ہم نے محسوس کیا ہے، جس طرح دلھن کی خاموشی شادی کا سبب بن جاتی ہے اسی طرح ہماری خاموشی بھی اپنا اثر دکھا کر رہتی ہے لیکن یہ واضح رہے کہ اگر میں اپنی خاموش ڈپلومیسی میں کامیاب رہا ہوں تو اس کا مطلب ہرگز نہیں کہ باقی سارے' دتّے گامے' بھی اسی طریقہ سے فیض یاب ہو سکتے ہیں۔ خاموش رہنا بالکل ایسے ہی ہے جیسے کریلے پکانا۔ جس طرح کریلے کی کڑواہٹ میں سے ذائقہ کشید کرنے کا ہنر کوئی کوئی جانتا ہے اسی طرح چُپ کا روزہ رکھ کر اس سے فیض یاب ہونا بھی ہر کسی کے بس کی

بات نہیں ہوتی۔

اصل میں لب کشائی کے حوالے سے انسانوں کی دو قسمیں ہیں۔ایک وہ جو بہت زیادہ بولتی ہے اور دوسری وہ جو بہت کم بولتی ہے۔اگر آپ ان دونوں قسم کے انسانوں کی حرکات میں موجود تضادات کا جائزہ لیں تو آپ کہہ اُٹھیں گے کہ بولنے والی کی دنیا الگ ہونا چاہیے تھی اور خاموش طبع لوگوں کی زمین الگ۔ میں تو انگشت بدنداں ہوں کہ ان دونوں گروہوں کا ایک معاشرے میں اب تک کیسے گزارا ہوتا رہا ہے۔نہیں معلوم کہ یہ خلافِ فطرت ساتھ کتنی دیر مزید چل سکتا ہے۔زیادہ بولنے والے دوسروں کا دماغ خرچ کرتے ہیں جب کہ کم بولنے والے صرف اور صرف اپنا۔زود گو جب بولتے ہیں تو لگتا ہے کہ کلاشنکوف کے منہ سے تڑاتڑ گولیاں نکل رہی ہیں مگر جب کم گو کچھ کہتے ہیں تو یوں محسوس ہوتا ہے کہ جیسے کسی باغیچے کے کسی پُرسکون گوشے میں سے آتی ہوئی کوئل کی آواز۔ بڑبولے' حضرات اپنی زبان درازی سے دہشت گردی کرتے ہیں جب کہ خاموش طبع پُرامن لوگ کبوتروں کی طرح' غٹرغوں' کرنے کے سوا کچھ بھی نہیں کرتے، بلا وجہ دخل درمعقولات ایک کی عادت ہوتی ہے تو اپنی دنیا میں مگن رہنا دوسرے کا اصول۔الغرض یہ دنیا ایک سینما گھر کی طرح ہے جہاں دو ہی قسم کے تماش بین اکٹھے ہوتے ہیں۔ایک وہ جنھوں نے آستینیں چڑھا کر اور گریبان پھڑوا کر ٹکٹ کٹوائے ہوتے ہیں اور ہال کے اندر سیٹیاں بجا کر بندروں کی طرح اُچھل کود کر ہیروئن کے رقص کی داد دے رہے ہوتے ہیں۔اور دوسرے وہ جنھوں نے ایڈوانس بکنگ کے ذریعے ٹکٹ حاصل کیا ہوتا ہے وہ بڑے اطمینان سے سینما ہال میں داخل ہوتے ہیں اور نہایت خاموشی سے سگریٹ سُلگا کر ٹانگ پر ٹانگ جمائے' تماشائے اہلِ ستم دیکھتے ہیں۔میں تو اُن دونوں گروہوں کی واضح تقسیم کے لیے دوقومی نظریہ بھی پیش کرنے کو تیار ہوں۔اُن دونوں کی نہ تو تہذیب ایک ہے اور نہ ثقافت، زبان ایک ہے نہ ادب' اخلاقی ضابطے ایک ہیں نہ روایات۔الغرض دنیا کے کسی بھی قانون کی رُو سے دیکھا جائے تو یہ واضح ہوتا ہے کہ کم بولنے والے لوگ ایک الگ قوم ہیں اور زیادہ بولنے والے الگ۔

اب چوں کہ باتونی حضرات کو اس دنیا سے نکال باہر کرنا مشکل ہے اس لیے دنیا والوں کو انتشار سے بچانے کا ایک ہی طریقہ ہے۔اور وہ یہ کہ زیادہ بولنے والے خواتین و حضرات کی الگ بستیاں آباد کی جائیں اور خاموش طبع لوگوں کی کالونیاں الگ۔ان دونوں رہائشی سکیموں کے درمیان کوئی رابطہ سڑک بھی نہیں ہونی چاہیے۔اس طرح ہر کسی کو اپنے ہم مزاجوں کے ساتھ زندگی کے دن پورے کرنے کا

موقع مل سکے گا۔ کیسی دلفریب صورتِ حال ہوگی جب محلّہ قیامت آباد میں ہر طرف غصے کے ماروں کی باچھوں سے جھاگیں بہہ رہی ہوں گی اور مُنہ پھاڑ پھاڑ کر اپنی اپنی رام کہانیاں سنائی جا رہی ہوں گی جب کہ دوسری طرف خاموش نگر کے علاقے میں اشاروں ہی اشاروں میں ایک دوسرے کا حال چال پوچھا جا رہا ہوگا اور آنکھوں کی زبانی باتیں ہو رہی ہوں گی۔

میرا ایک متضاد مزاج دوست خاموشی سے نفرت کرتا ہے۔ اُس کا کہنا ہے کہ سازشیں اور طوفان خاموشی سے جنم لیتے ہیں خاموشی اُکتا دینے والا سکوت ہے، لوگ خاموشی سے کہیں سے کہیں جا پہنچتے ہیں اور سب سے بڑھ کر یہ کہ خاموشی لوگوں کے عیب چھپا دیتی ہے۔ ہوسکتا ہے کہ یہ باتیں ٹھیک ہوں مگر مجھے اُن سے کیا غرض۔ میرا اپنا ایک مزاج ہے میرے اندر کی خاموشیاں مجھے سکوت کے نغمے گنگنانے پر مجبور کر دیتی ہیں۔ مجھے بلاضرورت پیدا کی گئی ہر آواز شور لگتی ہے۔ مجھے کبھی ہنسنا بھی پڑ جائے تو میں پاگلوں کی طرح منہ سے بے ہنگم انداز میں کچھ عجیب آوازیں نکالنے کے بجائے بڑے مہذب طریقے سے ہونٹوں کو شمالاً جنوباً پھیلا کر اپنی خوشی کا اظہار کر لیتا ہوں۔ اور اگر کبھی مجھے رونا پڑ جائے تو بھینسوں کی طرح ڈکارنے کے بجائے، اپنے کمرے میں جا کر تکیے میں سر چھپا کر 'سوں ساں' کر کے دل کا بوجھ ہلکا کر لیتا ہوں۔ اسی طرح اگر مجھے کسی سے اظہارِ محبت کرنا ہو تو بھی مجھے لہک لہک کر گا گا کر مطلوب کو وفا کا یقین دلانے کی ضرورت نہیں پڑتی۔ یہ کام میں اپنی آنکھوں سے بخوبی لے لیتا ہوں۔ حقیقت تو یہ ہے کہ نفرت ہو یا محبت، یہ سارے جذبے خاموشی تک پہنچ کر اپنی انتہا کو پہنچ جاتے ہیں۔ ہر وہ شخص جسے اپنے جذبات کی طاقت پر اعتماد ہوتا ہے وہ خاموش رہتا ہے۔ مگر یہ واضح رہے کہ اس ساری بات سے میرا یہ مطلب نہیں کہ آپ اپنے ہونٹوں کو سی لیں اور جب آپ سے آپ کا بزنس پارٹنر کوئی کاروباری بات پوچھے یا آپ سے آپ کا افسر کوئی ضروری فائل مانگے تو جواب میں آپ معنی خیز مسکراہٹ ہونٹوں پر سجا کر کھڑے ہو جائیں۔ اگر آپ ایسا کریں گے تو آپ کے گھر والے آپ کو پاگل خانے میں جا کر جمع کروا دیں گے اور آپ کی رسید بھی نہیں لیں گے۔

بہر حال یہ خالصتاً آپ کا مسئلہ ہے کہ آپ خاموشی کا کیسا اور کس قدر استعمال کرتے ہیں۔ جہاں تک میری ذات کا تعلق ہے میں تو خاموشی پر مرتا ہوں۔ میرا تو دل چاہتا ہے کہ خاموشی کا، ایک سمندر ہو اور میں اس میں مچھلی بن کر تیرتا پھروں یا پھر خاموشی ایک چائے کی پیالی ہو جس کو میں چسکی چسکی پی کر اپنے اندر اتار لوں۔ دراصل خاموشی کی ایک الگ کائنات ہے اور مجھ خلانورد کو جب بھی موقع ملتا

ہے' میں اس کائنات کی خاموش کہکشاں میں چہل قدمی ضرور کرتا ہو۔ لیکن اس رنگ میں ہمیشہ کوئی نہ کوئی آ کر بھنگ ڈال دیتا ہے۔ ابھی کل رات کی بات ہے' رات گئے میں نے اپنے بستر پر اپنی نیند کو سُلا دیا اور خود گھر سے باہر نکل کر سڑک پر آ گیا۔ یہ وہی سڑک تھی جہاں دن کے وقت ٹریفک دوڑتی رہتی تھی' مگر اس وقت یہاں پر صرف ایک پہریدار موجود تھا اور وہ بھی کھمبے سے ٹیک لگائے سو رہا تھا۔ لگتا تھا کہ سارا شہر افیون کھا کر سویا پڑا ہے۔ میں خاموشی کے منظر سے لطف اندوز ہونے لگا۔ مجھے ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ جیسے میں کوئی خاموش فلم دیکھ رہا ہوں۔ اس فلم میں سفید بدلیاں آسمان پر اٹھکیلیاں کرتی پھر رہی تھیں۔ ظالم جادوگر چاند ان معصوم بدلیوں سے چھیڑ خانی کر رہا تھا اور ہوا کے گھوڑے انھیں اس کے چُنگل سے دور لے جانے کی کوشش کر رہے تھے۔ بیل بوٹے درخت اس منظر کو دیکھ کر کھسر پھسر کر رہے تھے۔ تارے ٹوٹ ٹوٹ کر دوڑ رہے تھے۔ رات کی رانی کی بھینی بھینی خوشبو سارے منظر میں الجھ رہی تھی کہ اچانک۔۔۔۔ وہی ہوا جسکا مجھے ڈر تھا۔ قریب ہی کھڑے ایک گدھے نے آسمان کی طرف مُنہ اُٹھایا اور اپنی زبان میں راگ چھیڑ دیا۔ ساری خاموشی چکنا چُور ہو کر اس گدھے کے قدموں میں ڈھیر ہو گئی۔ اور میں پیر پٹختا' سر کھجلاتا اپنے گھر کو آ رہا جہاں میرا بستر میری بے بسی پر ہنس ہنس کر دوہرا ہو رہا تھا۔

☆☆☆☆

ڈاکٹر محبوب عالم

تعارف

اپنے بارے میں انکشاف کرنا تعارف کہلاتا ہے۔ گویا خود انکشافی کا دوسرا نام تعارف ہے اگر چہ تعارف کے لیے چند الفاظ ہی کافی ہوتے ہیں مگر بعض اوقات لمبی تمہید باندھ کر یہ فریضہ انجام دیا جاتا ہے۔ مکمل تعارف کروانے کے لیے لوگ اپنی حدوں سے باہر نکل آتے ہیں اور بینک بیلنس، کار، کوٹھی، پلاٹ وغیرہ سے لے کر شجرۂ نسب تک بتلا دیتے ہیں۔ زندگی کے اس کٹھن سفر میں ایک لمحہ ایسا بھی آتا ہے جب ہمیں اپنا تعارف دھاک بٹھانے کے لیے نہیں بلکہ خود کو اپنی ہی شناخت کروانے کے لیے کروانا پڑتا ہے۔ اپنے لبوں پر اپنا تعارف سجا دیکھ کر ہمارا دل مطمئن ہو جاتا ہے کہ ابھی ہم خود فراموشی کے درجوں میں داخل نہیں ہوئے ہیں۔ ہم اپنی ذات کا سراغ لگانے کے لیے کہیں سے کہیں ضرور نکل جاتے ہیں۔ مگر ایسی حالت میں بھی خود کو بھلانے سے قبل ہم خود کو اپنا تعارف کرا دیتے ہیں۔ دوسرے لوگ ہمارا تعارف سن کر یہ ضرور کہتے ہیں کہ آپ سے مل کر بڑی خوشی ہوئی۔ تاہم سچ پوچھیں تو اصل خوشی اپنے ہونے کے احساس سے ہوتی ہے۔ تعارف کرانا جہاں اپنے لیے بھی خوشگوار ثابت ہوتا ہے وہیں یہ دوسروں کو بھی خوشی فراہم کرنے کا ذریعہ بنتا ہے۔

میں نے بہت سے لوگوں کو صنفِ نازک سے تعارف کراتے وقت نئے نویلے دُولھا کی طرح لجاتے دیکھا ہے اور ایسے موقع پر اُن کے انگ انگ سے خوشی پھوٹتی دکھائی دیتی ہے۔ اگر چہ لوگ اپنی ذات کے نادیدہ پہلوؤں کو بھی نامعلوم لاشعوری خواہشوں کے تحت اپنے تعارف میں اُجاگر کرنے کی بھرپور سعی کرتے ہیں مگر میرے لیے سب سے مشکل کام اپنا تعارف کرانا ہے۔ شاید میں ابھی تک خود کو مکمل دریافت نہیں کر پایا ہوں اور جو تھوڑا بہت اپنے بارے میں جان سکا ہوں، اس پر بھی مجھے شک رہتا ہے کہ پتا نہیں صحیح بھی ہے یا نہیں؟ تشکیک کی اس فضا کے زیرِ اثر میں صرف اپنا نام بتانے پر اکتفا کرتا ہوں ۔تعارف کے ضمن میں اپنا نام بتلا تو دیتا ہوں مگر پھر خیال آتا ہے کہ واقعی میں اسمِ بامسمّیٰ ہوں بھی کہ نہیں؟ پوری دُنیا کا محبوب ہونا تو کجا میں تو ابھی تک خود کو بھی اپنا محبوب نہیں بنا سکا ہوں۔

جب کبھی میں خود سے یہ سوال کرتا ہوں کہ میرا تعارف کیا ہے؟ تو نواحِ جاں میں ہر طرف ایک گھمبیر سناٹا چھا جاتا ہے' یوں لگتا ہے جیسے کوئی بلا پھر گئی ہے! دیواروں سے یوں تو میں پہروں بلا تکان باتیں کر لیتا ہوں مگر جب ان سے یہی سوال کرتا ہوں تو یہ دیواریں میری مونس و غم خوار ہو کر بھی ایسے بن جاتی ہے جیسے ان کے کان ہی نہ ہوں۔ یہ صورتِ حال اُس وقت اور تکلیف دہ بن جاتی ہے جب میں خود کو آئینے میں دیکھتا ہوں۔ تجسس کی گہری دُھند میں لپٹا ہوا اپنا چہرہ دیکھ کر میں گھبرا اُٹھتا ہوں اور جب آئینے کے اُس پار ایک متفکر' متحیر اور متجسس چہرے کو اپنا تعارف کرواتا ہوں تو وہ نظریں جھکا لیتا ہے یا ادھر اُدھر دیکھنے لگتا ہے اور کچھ نہیں بن پاتا تو اپنی انگلیاں چہرے کے کیل مہاسوں اور چھائیوں پر پھیرنے لگ جاتا ہے (جیسے مجھ سے کوئی سروکار ہی نہ ہو!) کیل مہاسوں سے بھرے ہوئے اُس چہرے کو شاید میرا تعارف ادھورا لگتا ہے اور جواب میں اُس کی گہری خاموشی اس بات کی غماض ہوتی ہے کہ وہ تو اپنے بارے میں اب تک ''الف' ب'' بھی نہیں جان سکا پھر کس برتے پر وہ اپنا تعارف کرائے؟

میرا صحیح تعارف کیا ہو سکتا ہے؟ میں ہر لحہ' ہر آن اس کھوج میں لگا رہتا ہوں۔ دن بھر کتابیں پڑھتا ہوں، راتوں کو جاگ جاگ کر پھڑکتے ہوئے اشعار یاد کرنے کی کوشش کرتا ہوں' ہر روز نئے نئے لوگوں سے ملتا ہوں، کبھی جنگلوں' ریت کے ٹیلوں اور کہساروں کی خاک چھاننے نکل جاتا ہوں، بدلتے موسموں کی چیخیں سنتا ہوں، زرد پتوں کو شاخوں سے گرتے دیکھتا ہوں، نوزائیدہ کلیوں پر رقصندہ تتلیوں کی مدھ بھری آوازیں سنتا ہوں، بیٹھے بیٹھے کھو جاتا ہوں اور تصورات کی دنیا میں قدم رکھتے ہی نئے نئے جہانوں کی سیر کرتا ہوں، بھوک سے بلکتے، کاروں کے پیچھے بھاگتے اور سوکھی چھاتیوں سے چمٹے بچوں کو دیکھتا ہوں، آئس کریم پارلروں، فاسٹ فوڈ اور برگر پوائنٹس پر بڑی بڑی گاڑیوں کا ہجوم دیکھتا ہوں، دہقانوں کے مشقت سے چور جسموں سے اُٹھنے والی ناگوار بو کو اپنے نتھنوں میں سمو لیتا ہوں، روز تنگ اور تاریک گلیوں سے گزرتا ہوں' منہ بسورتے بچوں کو بھاری بستے اُٹھائے سکول جاتے دیکھتا ہوں، کبھی لذیذ کھانوں پر ٹوٹ کے پڑتا ہوں اور کبھی نانِ جویں کو بھی ترستا ہوں، محض اس لیے کہ شاید کہیں سے اس بات کا سراغ مل جائے کہ میں اصل میں کون ہوں؟ کس سیارے کی مخلوق ہوں اور میرا تعارف کیا ہے؟

کبھی کبھی مجھے اپنے اوپر عجیب سا شک ہونے لگتا ہے۔ اپنی ہستی کے اجزائے پریشاں یکا یک روئی کے گالوں کی طرح اُڑتے دکھائی دیتے ہیں۔ نظر کے سامنے کچھ اور ہی (کسی اور دنیا کے) منظر دکھائی دینے لگتے ہیں۔ ذہن دن کے اجالوں میں بھی تاریکیوں میں ڈوب جانے کی سعی کرتا ہے اور

اس سے قبل کہ میں چکرا کر گر پڑوں، میں اپنی ساری توانائیاں جمع کر کے اپنی جیب کے کونے کھدروں میں ہاتھ ڈالتا ہوں اور اپنا شناخت نامہ نکال کر ندیدوں کی طرح تکتا ہوں۔ اس پر لگی ہوئی اپنی ننھی منی پاریش تصویر (عہدِ شباب کا ایک ثبوت!) شناختی علامت' اپنا نام' پتا اور دستخط دیکھ کر میں خود سے دوبارہ متعارف ہو جاتا ہوں۔

بعض اوقات یہ شک اتنا قوی بھی ہو جاتا ہے کہ میں اپنی تصویر کو کنفرم (Confirm) کرنے کے لیے دیکھتا ہوں' گردن پر تل (شناختی علامت) ڈھونڈتا ہوں، اپنے ہی پتے پر خط لکھ کر پوسٹ کرتا ہوں (جو اگلے روز مجھے مل جاتا ہے!) گھر سے نکل کر سڑک پر آتا ہوں اور جب کوئی مجھے میرے نام سے مخاطب کرتا ہے تو یقین آتا ہے کہ "یہ میں ہی ہوں!" اپنا تعارف خوشی کی بات سہی مگر بعض اوقات میں رنجیدہ ہو جاتا ہوں کہ لوگ محض میرے تعارف سے خوش ہو جاتے ہیں اور میرے باطن میں جھانکنے کی زحمت بھی گوارا نہیں کرتے۔ ہاں' میرے تن کے اجلے کپڑے دیکھ کر میرے سٹیٹس (Status) کا اندازہ لگانے کی کوشش ضرور کرتے ہیں۔

دو پیار بھرے دلوں کو یکجا ہوتے دیکھ کر شہنائیوں کی گونج میں یہ خیال آتا ہے کہ یہ لوگ بھی کتنے کامیاب ہیں۔ اُن لوگوں نے اپنے رومانی جذبوں کا تعارف کتنے بھرپور انداز میں کرایا ہوگا اور ایک دوسرے کا زندگی بھر ساتھ نبھانے کے لیے کتنے ہی وعدے وعید کیے ہوں گے۔ ایک دوسرے سے اچھی طرح متعارف ہونے کے لیے ان پریمیوں نے کتنے پاپڑ بیلے ہوں گے۔ اُن لوگوں نے اپنے نخلِ تمنا کو خونِ جگر سے سینچا ہوگا، تب کہیں جا کر اُن کے ملن کی بیل منڈھے چڑھی ہوگی۔ ملن کی نرم نرم کونپلوں کو چھونے اور اُس لمس کو محسوس کرنے کا مزا ہی کچھ اور ہے۔

میں بہت نادم ہوں کہ میں اپنے لطیف اور روحانی جذبوں کا تعارف نہیں کرا سکا۔ دراصل میرے لیے ان کومل، نفیس اور پوتر جذبوں کا تعارف ایک مسئلہ بن گیا ہے۔ اس سے قبل کہ میں ملتجی آنکھوں کو اپنے اُن جذبوں کا تعارف کراؤں، میرے اندر کی گھمبیرتا سرکش جذبوں کا روپ دھار لیتی ہے' میرے پھول سے لبوں پر انگار لفظوں کا قبضہ ہو جاتا ہے اور پھول جھڑنے کے بجائے تلخیوں کی بارش ہونے لگتی ہے۔ میری نرم گفتاری اور کوملتا دھری کی دھری رہ جاتی ہے اور میں اپنے رویوں کے علی الرغم ایک اور ہی روپ میں سامنے آ جاتا ہوں میرا شعلہ فشاں رویہ دیکھ کر ملتجی آنکھوں میں خوف کی پرچھائیاں سمٹ آتی ہیں اور میرے سرکش جذبوں کا لاوا (تعارف!) ٹھنڈا ہونے سے قبل ہی اُن آنکھوں میں

آشاؤں اور آشنائی کے دیپ بجھنے لگتے ہیں۔ متوقع ازدواجی مسرتوں میں سرکش جذبے کباب میں ہڈی کی مانند نظر آتے ہیں۔ بابِ آشنائی بند ہوتا دیکھ کر میرے دل کے خارزاروں میں ایک صدا اُٹھتی ہے کہ نہ کسی کی آنکھ کا نور ہوں میں، نہ کسی کے دل کا قرار ہوں۔ کسی محفل میں جب تعارف کا سلسلہ چل نکلتا ہے تو اکثر مجھے اس قسم کے جملے سننے کو ملتے ہیں۔

''مجھے اجمل کہتے ہیں''، ''میں جمال ہوں''''میں حسیب ہوں''''مسز قریشی''''مسز شبینہ'' ''مس سائرہ پروین''''مائے نیم ِسبنذ' (شوہر نامدار) جمیل الرحمٰن''۔

میں یہ دیکھ کر حیرت زدہ رہ جاتا ہوں کہ اتنے خوبصورت ناموں کے مالک یہ لوگ اتنی کم عمری میں اپنے بارے میں کیسے جان گئے ہیں؟ میرے لیے تو ''محبوب'' کہنا ہی مشکل ہو جاتا ہے۔ الفاظ کا دامن گلے میں اٹکتے ہوئے کانٹوں میں الجھ کر تار تار ہو جاتا ہے۔ بڑی مشکل سے میں تھوک نگل کر ''محبوب'' کہہ پاتا ہوں۔ کوشش کرتا ہوں کہ چپ ہی رہوں وگرنہ کسی شوخ نے کہہ دیا ''کس کا محبوب؟'' تو سخت مشکل میں گرفتار ہو جاؤں گا۔ بعض اوقات انسان اپنا تعارف کروا کر پھنس جاتا ہے۔

خود سے تعارف حاصل کرنا معرفت کی پہلی منزل ہے اور خود آگاہی کا ملنا کوئی شیر مادر نہیں ہے۔ اس کی تلاش میں تو صدیاں بیت جاتی ہیں۔ جنگلوں، صحراؤں اور کوہساروں میں دھونی رما کے بیٹھنا پڑتا ہے، سالوں کسی پیڑ تلے آسن جمانا پڑتا ہے اپنے من کے اندر کنڈلی مار کر بیٹھی ہوئی ''میں'' کو مارنا پڑتا ہے، دید کی پیاسی نظروں میں پیا ملن کی جوت جگانی پڑتی ہے، چشمِ قلب کو وا کرنا پڑتا ہے، دل کی لگن سے چشمِ فلک کو حیران کرنا پڑتا ہے، جسم پر جمی ہوئی حرص و ہوس کی مایا اور نفس کی غلاظتوں کو دھونا پڑتا ہے، تسلیم و رضا کی تصویر بننا پڑتا ہے تب کہیں جا کر امید کی جاسکتی ہے کہ نروان یا اپنی ذات کا عرفان حاصل ہو۔ اتنے کشٹ کے بعد بھی صرف اُمید۔ انسان کو اپنے ذات کا ادراک (تعارف) ہو جائے، اس سے بڑھ کر بھی کوئی بات ہوسکتی ہے۔ اُمید پر دنیا قائم ہے! 'انسان کیا' کائنات کے بے شمار مظاہر کو بھی اپنا صحیح پتا نہیں ہے۔ میری نظر میں تو دریا کے دو کنارے بھی اپنا مکمل تعارف نہیں ہیں۔ دریا کا اصل تعارف تو اس کا وہ تیسرا کنارہ ہے جو دریا دلوں کی نظروں سے بھی اوجھل ہے اور خود دریا بھی آج تک اسی کی کھوج میں سرپٹ دوڑ رہا ہے۔ کبھی کبھی اسے ''تیسرا کنارہ'' کی بستیوں یا شہر میں روپوش ہونے کی مخبری ہوتی ہے تو یہ کسی غول بیاباں یا کسی غضب ناک عورت کی طرح پھرتا ہوا شہروں کا رُخ کر لیتا ہے اور جو چیز اس کے سامنے آتی ہے، اسے تلپٹ اور تاراج کر دیتا ہے۔

''تعارف''، تکمیل کا نام ہے اور اس کی خاطر معصوم جانوں کا خون بھی کرنا پڑتا ہے اور کتنے ہی سروں کو اپنے قدموں تلے روندنا پڑتا ہے۔ موسموں کا ماجرا بھی یہی ہے۔ موسم حدت، برودت، خزاں اور بہار سے عبارت ہے، مگر ان چار موسموں نے بھی ہمیں آج تک سخت اندھیرے میں رکھا ہوا ہے۔ ان موسموں نے آج تک ہمیں اس پانچویں موسم کا تعارف نہیں کروایا ہے جو اپنے اندر ہر موسم کی خُو رکھتا ہے۔ میری نظر میں ہر موسم یا تو پانچویں موسم کی تلاش میں نمودار ہوتا ہے یا اُس کی تلاش میں اگلے موسم کو آگے روانہ کر دیتا ہے (خود تھک جاتا ہے) پتا نہیں پانچواں موسم اُس سے کب کیسے اور کیوں کر بچھڑا تھا؟ اس راز پر ابھی تک پردہ پڑا ہوا ہے۔ موسموں کا یوں مارا مارا پھرنا بھی ہماری طبائع پر گہرا اثر چھوڑتا ہے۔ ہمارے اندر بھی یہ امنگ پیدا ہوتی ہے کہ ہم بھی اپنی ذات کا سراغ لگانے کے لیے اینٹ، گارے اور لکڑی کے بوسیدہ مسکن سے نکل کر مہکتے بنوں، چہکتے گلزاروں، ہنستے پربتوں، چمکتے صحراؤں اور سونے ایسے دمکتے میدانوں میں آبلہ پائی کریں اور اپنی گم شدہ میراث کو لے کر گھر لوٹیں۔

جب کوئی صاحب (یا صاحبہ) زبردستی مجھے اپنا تعارف کروانے کی کوشش کرتا ہے تو مجھے یوں لگتا ہے جیسے کوئی میرے جسم کی سرسبز شاخوں پر کلہاڑا چلا رہا ہے یا میری سماعتوں میں لفظوں کا پگھلا ہوا سیسہ انڈیل رہا ہے۔ مگر تعارف کے نشے میں سرشار لوگوں کو میری تکلیف کا احساس تک نہیں ہوتا۔ تعارف ایک ایسی کڑوی گولی ہے جسے بغیر پانی کے نگلنا پڑتا ہے۔ تعارف آگ کا سمندر ہے جسے تیر کر پار کرنا ہے۔ تعارف تو درحقیقت ایک ایسا عمل ہے جس کے نتیجے میں یوریکا! یوریکا (میں نے پالیا! میں نے پالیا) کی صدائیں بلند ہوتی ہیں مگر یہاں تو سب کچھ کھو کر بھی ایسی صدائیں بلند ہو رہی ہیں۔ تعارف تو ایک ایسا چشمہ ہے جو یک بارگی پورے جوش و خروش سے اُبلتا ہے اور پیاسوں کی طرف لپکتا ہے، مگر سرد مہری کا عفریت اُسے سموچا نگل جاتا ہے۔ صحیح قسم کا تعارف ایک ایسی آبشار کی مانند ہے جس کے گرد کھڑے ہو کر ہمارے جسم کا درجہ حرارت گر جاتا ہے، جس کی آواز سن کر ہمارا تن من جھوم اُٹھتا ہے اور جس کے نیچے کھڑے ہو جائیں تو قلفی سی جمنے لگتی ہے۔ تعارف تو وہ بُور کے لڈو ہیں جو نہ کھائے بنے اور نہ اُگلے بنے! یعنی جس نے کھایا وہ بھی پچھتایا اور جس نے نہ کھایا وہ بھی پچھتایا! تعارف تو رنگا سیار ہے۔ تعارف تو شیر کے بھیس میں چھپا ہوا گیدڑ ہے۔ تعارف کھوٹا سکہ ہے جو اندھیروں کے شہر میں چل جاتا ہے اور شہرِ بصیرت میں اسے پرکھ کی کسوٹی سے گزارا جاتا ہے، اگر کھرا ثابت ہو جائے تو اجنبیت کی ساری دیواریں گر جاتی ہیں اور امتیاز من و تو جاتا رہتا ہے۔

بڑے لوگوں کا تعارف ''خان بہادر'' ''رائے صاحب'' ''جنرل صاحب'' ''سیکریٹری صاحب'' وغیرہ ہوتا ہے۔ چھوٹے لوگوں کا تعارف ان کا پیشہ ہے یعنی ''دھوبی'' ''موچی'' ''نائی'' ''کونجڑا'' ''گھسیارا'' ''رنگریز'' ''رنگ ساز''، ہے۔ تعارف کا یہ روپ دراصل انتہائی خوفناک ہے۔ میں تعارف کے اس روپ سے ہمہ وقت خوف زدہ رہتا ہوں۔ کوئی بھی اجنبی مجھے آسانی سے ''تعارف'' کا رگڑا لگا سکتا ہے۔

سید تحسین گیلانی

بیل گاڑی

بیل گاڑی پر بیٹھ کر جب میں بیلوں کی باگیں تھامے، انھیں ہانکتے ہوئے، کھیتوں کی طرف جا رہا ہوتا ہوں تو مجھے یوں محسوس ہوتا ہے جیسے میں تسخیر کائنات کے لیے نکل کھڑا ہوا ہوں۔ اس سفر میں بیل' گائیڈ کی حیثیت سے میرے ہمراہ ہوتے ہیں اُن کی باوقار اور شاہانہ چال مجھے آگہی کے بام و در تک لے جاتی ہے۔ اُن کی پروقار مست خرامی مجھے قدرت کے اتنا قریب کر دیتی ہے کہ میں ہر پتے' ہر بوٹے میں خود سے ہم کلام ہوتا ہوں۔ میں کبھی برق رفتار زندگی میں اس نادر تجربے تک دسترس حاصل نہ کر سکا تھا۔ دراصل میں دوسروں سے ملتے ملتے اتنا تھک جاتا ہوں کہ کبھی خود سے ملنے کا موقع ہی نہیں ملتا۔ میں سوچتا ہوں کہ یہ مجھے چاند گاڑی میں بیٹھ کر کبھی نہ مل پاتا۔ اس سواری کا راہی تو زندگی اور موت کے بیچ بھنور میں ڈگمگاتی ناؤ کے اُس مسافر کی طرح ہوتا ہے جو خود کو ڈوبتے دیکھ کر بھی اپنے آپ کو بچا نہیں پاتا جب کہ بیل گاڑی کے سفر میں' میں قدرت کے رنگوں میں اس قدر کھو جاتا ہوں کہ جامن کے پیڑ کی گھنی چھاؤں (جہاں میرے بیل خود بخود رُک جاتے ہیں) مجھے کھینچ کھینچ کر کہتی ہے: مجھے تمھارے عقیدے' دولت یا پیشے سے کوئی غرض نہیں' میرا کام تو ''دینا'' ہے لینے والا کون ہے' یہ سوچنا میرا کام نہیں کیوں کہ سوچیں تو قید کر لیتی ہیں جیسے تم رسموں' عقیدوں اور طبقوں میں مقید ہو اور اسی کو اصل زندگی سمجھ رہے ہو۔ یہ دیکھو! بلبل' ہدہد' کوئل' سب میرا حصہ ہیں' بلا تفریق و تقسیم ''آج'' اور ''کل'' سے ناآشنا خوشیوں کی سانجھ بانٹ رہے ہیں' ہر بے رنگی میں رنگ بھر رہے ہیں' حقیقت میں یہی کائنات کا اصل ہیں' ان کی خوشی ان کے ہونے میں ہے۔۔۔۔رُکو!۔۔۔۔بیل پھر چلنا شروع کر دیتے ہیں اور جب ان کے سموں سے ٹکرا کر اُڑتی ہوئی دھول نتھنوں میں داخل ہوتی ہے تو مجھے ایسا لگتا ہے جیسے یہ میرے ہی بدن کی باس ہے۔ مجھے محسوس ہوتا ہے کہ یہ مٹی ہی میری نہیں' میں ہی یہ مٹی ہوں۔۔۔۔عظیم فاتح۔ سیاح۔ حریت پسند اور جنگ جو مجھی پر گھوڑے دوڑاتے رہے ہیں اور میری ہی تلاش میں پھرتے رہے ہیں' آج اس میں وہ بھی شامل ہیں۔

میں گارے اور مٹی میں لتھڑے ہوئے اُن مرد وزن کو دیکھتا ہوں جو دھان کی کاشت کر رہے ہیں.....دھرتی کی چادر پر بیل بوٹے اُگانے والے یہ لوگ!۔۔۔ان کا وجود مجھ سے الگ نہیں۔ محض چاول کی بوریاں گننے والا اور ایک آدھ بوری کے گم یا کم ہونے پر نوکروں کی درگت بنا دینے والا ڈاکا ندار بھلا کیا جانے کے یہ بیج بوتا جزا ہے کہ سزا! کاشت کار کے چہرے کی آفاقی مسکراہٹ (جسے میں ٹھنڈی گاڑی میں بیٹھ کر کبھی نہیں دیکھ پاتا) جس کا سواگت ان کے ارد گرد رقص کرتے بگلے' چڑیا اور لم ڈھینگ کرتے ہیں' گردن فرازانِ زمانہ کی موم پوش آنکھیں بھلا کیسے دیکھ سکتی ہیں! فطرت انھیں اپنی نرم وگداز گود میں لوریاں دیتی ہے۔ یہی تو سکون ہے' اس طمانیت کا احساس کسی محل میں بیٹھ کر پریشان اور بے خواب نودولتیا بھلا کیسے کر سکتا ہے! شاید مجھ پر بھی یہ دھرتی پُتر کبھی عیاں نہ ہوتے اگر مجھے بیل گاڑی کی معیت نصیب نہ ہوتی۔

سفر بڑی آہستگی سے طے ہوتا ہے۔ یہی وہ دھیما پن ہے جو کائنات کی خوبصورتی کو مجھ میں جذب کر دیتا ہے۔ میں ہنستے کھیتوں' گاتے پرندوں' بہتے کھالوں اور بے ثمر مگر بالیدہ چناروں سے گفتگو کرتے ہوئے آگے ہی آگے بڑھتا جاتا ہوں اور کبھی پیچھے مڑ کر نہیں دیکھتا، مبادا کہ عقب میں کوئی پُرونس کھڑا ہو!

بیل گاڑی کو میں رومانس کا سمبل کہتا ہوں۔ رومانس کے ذکر نے آپ کے ذہن میں فوراً ہیر رانجھا' لیلیٰ مجنوں' سسی پنوں' یا اپنے کسی محبوب کی یاد کو گدگدایا ہوگا (''کسی'' کا لفظ میں نے دانستہ استعمال کیا ہے) اور ہونا بھی یوں ہی چاہیے' اس میں آپ کا کیا قصور! قصوروار تو میں ہوں' بھلا جھگڑے اور رومانس کا کیا تعلق؟ مگر جناب کسی الھڑ مٹیار کی خوبصورت آنکھوں' زلفوں یا رخساروں پر مر مٹنا اور آخر کار کپڑے پھاڑ کر در بدر ہو جانا ہی تو رومانس نہیں' یہ ایک جذبہ ہے جو خواہشات سے بے نیاز ہو کر صرف ''لٹ'' جانے کا نام ہے' صرف ''دینے'' کا نام.....جیسا کہ جامن کے پیڑ اور کوئل' بلبل' ہد ہد کا رومانس' اپنی مٹی سے دھرتی پُتر کا رومانس بچے سے ماں کا رومانس۔

میں جب بیل گاڑی کا سفر کر کے گھر لوٹتا ہوں تو گاؤں کی ہر گلی بانہیں پھیلا کر میرا استقبال کرتی ہے۔ مجھے ذرہ بھی کائنات دکھائی دیتا ہے (اکیسویں صدی کی کوانٹم طبیعیات کی طرح) تاہم میرا فزکس سے کوئی زیادہ واسطہ نہیں۔ مجھے تو یہ علم دیہات کی سادہ سوندھی اور پُر خلوص مٹی نے بیل گاڑی کی وساطت سے عطا کیا ہے جس کے لیے میں اس کا شکر گزار ہوں۔ دیدۂ بینا ہو تو ہر چیز حسین نظر آتی ہے۔

میں خود کو روکتے ہوئے بھی روک نہیں پاتا۔ میں ہر چیز میں شامل ہو کر اس سے ملتا اور باتیں کرتا ہوں' سب کو اپنا آپ پیش کرتا ہوں۔ ''دینے'' کا یہ فن میں نے بیل گاڑی کے سفر سے ہی حاصل کیا ہے۔ اصلاً میں اس نشے میں سرشار ہوں کہ میں ہوں۔ پھر میں اپنے اندر پرواز کرتا ہوں تو ''حیرانی'' کو دیکھتا ہوں مگر اسے مصروفِ فکر چھوڑ کر محض اس لیے آگے نکل جاتا ہوں کہ یہ تو مہمان ہے، کچھ ہی دیر میں رخصت ہو جائے گی اور میں اپنے ''اندر'' اور ''باہر'' کی تقسیم سے آزاد ہو جاؤں گا۔

ہاں یاد آیا' بیل گاڑی کی معیت میں جب میں بیلوں کی باگیں کھینچتا ہوں تو جواباً وہ بھی اپنی گردن کو اثبات میں ہلا دیتے ہیں جس سے میں نے یہ دقیع نتیجہ اخذ کیا ہے کہ انسان کی طرح سب مال بردار جانور بھی خلوص اور انتہائی محبت کا جواب ''غمزہ و عشوہ و ادا'' سے دیتے ہیں آپ بھی تو میری طرح حیوانِ ناطق ہیں' ذرا غور کیجیے نا۔

☆☆☆☆

عامر عبداللہ
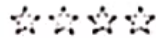
تیز رفتاری

جب سورج کی پہلی کرن زمین کی شانت سطح پر نازک پتی کی طرح گرتی ہے' اِس کے لمس سے ہر شے مہکنے لگ جاتی ہے' اور چاروں جانب انوکھے رنگ بکھر جاتے ہیں۔ پرندے گھونسلوں سے' کرمک بلوں سے اور انسان گھروں سے نکل پڑتے ہیں۔ میں بھی اپنے گھر سے نکل آتا ہوں۔ گھر' جو ہر شب' میرے جسم اور رُوح کی ساری تھکن چین لیتا ہے' اور ہر صبح' میرے اندر تازگی اور سرشاری بھر کر مجھے سفر کے لیے چاق و چوبند کر دیتا ہے۔

میں گھر سے نکلتا ہوں تو سارا گھر لوگوں سے اَٹا دکھائی دیتا ہے۔ ہر نفس بے قرار' دوڑتا بھاگتا ہوا' آکاش کو چھو لینے کا تمنائی محسوس ہوتا ہے۔ تیز رفتاری سب کی چال میں' آنکھوں اور تصورات میں رچی بسی لگتی ہے۔ سب جلد سے جلد اپنی منزل تک پہنچنا چاہتے ہیں' ایک لمحے کی تاخیر بھی گوارا نہیں کرتے۔ بار بار گھڑی دیکھتے ہوئے اُن کی سانسیں مزید پھولنے لگتی ہیں اور سخت گیر باس (Boss) کی آنکھوں کی تپش اور لہجے کی کڑواہٹ راستے ہی میں اُن کے اندر اُترنے لگتی ہے۔ ہر روز ایسا ہوتا ہے اور ہر روز میں اس بے ہنگم ہجوم میں شامل' بے قرار' مضمحل اپنی منزل کی جانب رواں رہتا ہوں۔

لیکن آج انوکھا واقعہ ہوا جس سے میرے وجود پر تیز رفتاری کی گرفت ڈھیلی پڑ گئی ہے۔ چلتے چلتے راستے میں پڑے ایک پتھر سے ٹھوکر لگی اور مجھے چند لمحوں کے لیے رُکنا پڑ گیا۔ یوں محسوس ہوا جیسے مجھے ایک تیز رفتار قافلے سے یک لخت الگ کر دیا گیا ہے اور باقی قافلہ پوری رفتار سے میرے قریب سے گزر رہا ہے' جس کے باعث ایک لمحے کے لیے تو میں بھاگتے قدموں سے اُٹھتی گرد کی دبیز تہہ میں گھر گیا اور میرے اردگرد کے سارے مناظر گم ہو گئے۔ لیکن چند ثانیوں کے بعد میرے حواس کچھ بحال ہوئے تو احساس ہوا جیسے پتھر نے جان بوجھ کر میرا راستہ روکا ہے اور میرے قدموں سے لپٹ کر دُہائی دے رہا ہے کہ بھلے مانس' کہاں بھاگے جاتے ہو' اس تیز رفتاری سے منزل قریب تو نہیں آ جائے گی' یوں ہی بھاگتے رہے تو تمھارے پاس چند سانسوں کی جو جمع پونجی بچی ہے' اُسے جلد ہی خرچ کر بیٹھو گے' ذرا

ٹھہرو، نیچے اور اردگرد دیکھ کر چلو۔

یہ چند لمحے انکشاف کے وہ لمحے ثابت ہوئے ہیں جب صدیوں پر پہلے اسرار بھی اچانک حیطۂ اِدراک میں سمٹ آتے ہیں اور ایک نئی حقیقت کے رُخ سے نقاب ہٹ جاتی ہے۔ انھیں چند لحظوں میں پہلی مرتبہ مجھ پر ٹھوکر کا مفہوم واضح ہوا ہے۔ میں سمجھتا تھا کہ ٹھوکر ظاہری سطح پر ہو یا باطنی سطح پر، ہمیں منزل پر پہنچنے سے روکنے کے لیے نمودار ہوتی ہے اور ہماری رفتار میں خلل اندازی کی مرتکب ہوتی ہے، اور اس کی عطا دُکھ کے سوا کچھ نہیں۔ لیکن مجھے آج خبر ہوئی ہے کہ ٹھوکر تو پرانے اور بوسیدہ رستوں سے نجات دلاتی ہے اور نئے رستے خلق کرنے کی ترغیب دیتی ہے۔ جب ہم ایک ہی رفتار سے چلتے چلتے اردگرد اور اپنے آپ سے بےخبر ہونے لگتے ہیں تو یہ ہمیں خبردار کر کے سفر کی ایک بالکل نئی جہت سے آشنا کر دیتی ہے۔ دراصل یہ تخلیقِ تازہ کے جنم سے پہلے کی وہ کیفیت ہے جب بظاہر تو درد اپنی انتہا پر پہنچا ہوتا ہے لیکن اس کے عقب میں ایک معصوم سے وجود کی نمود کا عمل تکمیل پا رہا ہوتا ہے۔

مجھے اپنی اور اردگرد کے لوگوں کی تیز رفتاری کی لایعنیت کا عرفاں بھی انھیں چند ساعتوں میں حاصل ہوا ہے اور میں نے اس ماحول کا ایک معمولی کل پرزہ بننے کے بجائے الگ ہو کر ایک ناظر کے طور پر اس کا مشاہدہ کیا ہے۔

میں نے چند لمحوں کے توقف کے بعد دوبارہ چلنا شروع کیا ہے۔ میری رفتار بہت دھیمی ہو گئی ہے۔ اس سے جہاں تیز رفتاری سے پھیلنے والے انتشار کی دستبرد سے محفوظ ہو گیا ہوں، وہیں میں تمام مناظر اور لوگوں کو بھی اپنے بہت قریب محسوس کرنے لگا ہوں۔ مجھے ان بےچین لوگوں پر، اس ساعت انکشاف سے پہلے میں خود بھی جن میں شامل تھا، بہت ترس آ رہا ہے۔ میں سوچتا ہوں، یہ زندگی کتنی پھیکی اور بےرس ہے، جس میں ہر پل ایک کھونٹے سے بندھے ہونے کا احساس بھی حاوی ہے اور صبح شام ایک متعین منزل تک پہنچنے کا جبر بھی! اور یہ لوگ کتنے بےبس ہیں کہ گلے میں ضرورتوں اور مجبوریوں کی موٹی رسی پڑی ہے اور انھیں ہانکا جا رہا ہے۔ ان کی گردنیں چھلی جاتی ہیں لیکن انھیں پھر بھی چلنا پڑتا ہے۔ انھیں یہ جاننے کی بھی مہلت نہیں کہ بادِ صبا کلیوں سے کیا سرگوشی کر گئی ہے! اور جب کوئی مست جھونکا پھولوں کو چھو جاتا ہے تو یہ نازک بدن اپنے اندر سمٹ سمٹ کیوں جاتے ہیں! گھاس کی نوک پر رُکے موتیوں ایسے ننھے ننھے قطرے جب شب کے دکھ کی داستان کہنے آتے ہیں، انھیں خبر کیوں نہیں ہوتی! سرِ راہ کسی پری چہرہ سے لحہ بھر کے لیے آنکھ مل جانے کے لطف کو، جو انھیں حسن کی کشش اور عشق کی تڑپ

سے آشنا کر سکتا ہے' محسوس کیوں نہیں کرتے! کیا صرف تیز رفتاری کے دیو کے اشاروں پر ناچتے رہنا ہی ان کے بس میں ہے؟

میں اب سمجھتا ہوں کہ ان کی یہ تیز رفتاری فطری نہیں' اختیاری ہے کیوں کہ جب میں آسمان کی نیلگوں وسعتوں میں جھانکتا ہوں تو وہاں پرندے قطار اندر قطار عازم سفر دکھائی دیتے ہیں۔ منزل تو پرندوں کی بھی وہی ہے جو انسانوں کی ہے لیکن پرندوں کی اُڑان میں نہ تو کوئی بے چینی دکھائی دیتی ہے اور نہ ہی بے قراری۔ بس ایک عجیب سی طمانیت اور سکوں ان کی اُڑان میں جھلکتا ہے جیسے انھیں اپنی منزل پالینے کا پورا یقین ہو۔ ایسے میں مجھے تیز رفتاری بالکل غیر فطری اور ارادی لگنے لگتی ہے۔

مجھے ایسا بھی محسوس ہوتا ہے کہ یہ لوگ اپنے ازلی حریف' وقت کی اسیری سے چھٹکارا پانے کے لیے تیز رفتاری کا سہارا لے رہے ہیں۔ لیکن یہ بھی کسی طور ممکن نہیں کیوں کہ وقت کی قید سے رہائی پانے کے لیے تو عمودی سفر کی ضرورت ہوتی ہے جب کہ ان کا سفر سراسر افقی ہے اور یوں بھی عمودی سفر میں آہستہ روی زیادہ اہم ہوتی ہے۔ یہ اپنی دُھن میں دوڑ رہے ہیں اور اس طرح کبھی وقت کی قید سے رہائی حاصل نہیں کر پائیں گے تاہم المیہ یہ نہیں کہ انھیں قید کر دیا گیا ہے' المیہ تو یہ ہے کہ انھیں اپنے قیدی ہونے کا احساس تک نہیں۔ یہ تماشا ہیں لیکن ماننے کو تیار ہی نہیں کہ کوئی ڈگڈگی بجا کر ان سے نئے نئے کرتبوں کی فرمائش کر رہا ہے' اور وہ جب بھی ''بول جمورے'' کی تان لگاتا ہے' یہ بے اختیار اُس کے حکم کی تعمیل میں سرگرم ہو جاتے ہیں۔

یہ بے خبر لوگ ہیں' نہیں جانتے کہ اس قید سے رہائی ممکن ہے۔ میں تو کہتا ہوں کہ اس مشقت سے آزاد ہونے کے ہزاروں راستے اور بے شمار دروازے ہیں۔ بس آنکھ، باطن میں موجود نرم و لطیف روشنی کے اُس منبع کی طرف مرکوز ہونی چاہیے جس سے وابستہ ہو جانے کے بعد ہر طرح کا بکھراؤ ختم ہو جاتا ہے اور ہر صبح ایک نئی زندگی کے پہلے دن کی طرح طلوع ہوتی ہے۔

☆☆☆☆

ساجدہ نواز

کالا کوّا

گاؤں کی آبادی کا ایک بڑا حصّہ کوّوں پر مشتمل ہے۔ کالے کوّے جو گاؤں کے ہر گھر کی منڈیر پر اور دیہی لوک گیتوں میں جا بجا دکھائی دیتے ہیں۔ کوّے اور دیہات کا چولی دامن کا ساتھ ہے۔ کوّے کے بغیر دیہات کا تصور ادھورا اور دیہات کے بغیر کوّے کا رہنا محال! کوا بعض اوقات تبدیلی آب و ہوا کی خاطر شہر کا رخ بھی کرتا ہے مگر جلد ہی لوٹ آتا ہے۔ شہر کی بے حد مصروف اور الجھی ہوئی زندگی سے کوا جلد ہی اکتا جاتا ہے۔ تاہم ایسا نہیں کہ شہر کوّے کو اپنے دل میں جگہ نہیں دیتا اور دیہات کے لوگ کوّوں کے عاشق ہوتے ہیں۔ سچ تو یہ ہے کہ دیہات ہو یا شہر کوّے ہر جگہ ناپسندیدہ ہیں۔ کوّے کے لیے انسان کے دل میں ایک گہری اور قدیمی نفرت موجود ہے۔ شاید کوئی دوسرا پرندہ اس قدر ناپسندیدہ نہیں، جس قدر کہ کاگ ہے۔

انسان تمام پرندے گھر میں پالتا ہے لیکن کہیں بھی کوّے کو اس لائق نہیں سمجھا جاتا۔ شاید کوّے کو فطرت کے مظاہر میں شامل ہی نہیں سمجھتا۔ تاہم اس کی وجہ محض اس کی سیاہ رنگت نہیں بلکہ اس کی بھدی آواز بھی ہے جو اس کی بدصورتی کو اور بھی اجاگر کر دیتی ہے۔ کوّے کو اس سوال کا پورا حق حاصل ہے کہ اگر خوبصورتی کا معیار محض جسمانی حسن ہے تو دنیا کے کتنے فیصد انسان خوبصورت ہیں اور اگر سریلی آواز ہی باعثِ پسندیدگی ہے تو کوئل کے علاوہ سب جاندار ناپسندیدہ ہیں۔

کوا اپنی جسمانی بدصورتی سے احساسِ کمتری میں مبتلا نہیں ہوتا کیوں کہ یہ بدصورتی اس کے حق میں ہے۔ انسان جس چیز کو پسند کرتا ہے اسے اپنا اسیر بنا لیتا ہے۔ پنجروں میں بند خوبصورت پرندے تمام عمر اپنی خوبصورتی پر نوحہ کناں رہتے ہیں کیوں کہ ان کی خوبصورتی ہی ان کی آزادی کی دشمن ثابت ہوتی ہے۔ کالے کوّے کے لیے پھندا تیار نہیں ہوتا۔ قید ہونے کے خطرات سے یکسر آزاد کوا تمام خوبصورت پرندوں کے لیے باعثِ رشک ہے۔ کاگ اپنی بدصورتی پر نازاں ہے کیوں کہ خوبصورتی کے عوض آزادی کا سودا کسی طور بھی معقول نہیں۔

منڈیر پر بولتا کوا دیہاتی حسیناؤں کی سانسوں کو بے ترتیب کر دیتا ہے کیوں کہ یہ دل پسند مہمان کی آمد کا سندیسا لاتا ہے اور بطورِ انعام مٹیاروں کے ہاتھوں سے میٹھی چُوری کھاتا ہے۔

کوّے کی سیرت کی بعض خوبیاں اسے دوسرے پرندوں سے ممتاز کرتی ہیں۔ اس کی تمام دانش مندی دنیاوی مفادات تک محدود ہے۔ یہ پیٹ کا بہت بڑا بچاری ہے مگر یہ بھکاری کی طرح بھی کبھی روٹی کے لیے دردر نہیں بھٹکتا بلکہ دوران میں پرواز اسے جہاں بھی تر نوالہ نظر آتا ہے' یہ تمام خوف اور اخلاقیات کو بالائے طاق رکھ کر اسے لے اُڑتا ہے۔ یہ طاقتور قوموں کے اس نظریے پر یقین رکھتا ہے کہ جو چیز درکار ہو اسے چھین لو۔ جو مزا طاقت سے ہتھیانے میں ہے وہ پاؤں پڑ کر اور دامن پکڑ کر حاصل کرنے میں کہاں؟ زاغ کے لیے عاجزی ذلت ہے اور طاقت شان۔

کوا بظاہر جس قدر کھردرا ہے اندر سے اتنا ہی نرم دل ہے۔ انسان کے ہاتھ سے چھین کر کھانے والا سیاہ فام اپنے ساتھی کوّوں کے ساتھ بہت ہمدرد ہے۔ اپنے کسی ساتھی کی موت پر کوئی اور ہم جنس اس قدر آہ و بکا نہیں کرتا جس قدر کوا۔ اپنے ہم جنس کی مرگ کی اطلاع ملتے ہی قرب و جوار کے تمام کوّے اپنی مصروفیات اور مشاغل ترک کر کے جائے مرگ پر پہنچتے اور ماتمی صدائیں بلند کرتے اور اپنے ساتھی کے قاتل کی جستجو کرتے ہیں۔ اور اگر ماتمی کوّوں کے جتھے کو وہ قاتل دکھائی دے تو اسے بغیر کسی ترائل کے سزا دینے کی کوشش کی جاتی ہے۔ وہ قاتل ان سب کوّوں کا مشترکہ دشمن ہوتا ہے' جسے معاف کرنا وہ جانتے ہی نہیں۔ کوّوں کی کمیونٹی میں لسانی اور نسلی فرقہ واری بالکل نہیں' اس لیے ایک کوا دوسرے کوّے کے خون کا پیاسا بھی نہیں ہوتا۔ چوں کہ کوّے سیاہ اور سفید کی تمیز سے آزاد ہیں اس لیے وہ سب بھائی بھائی ہیں اور ہر ایک کی دائمی جدائی پر یکساں دُکھ کا اظہار کرتے ہیں۔

انسان صرف کالے کوّے کو ہی ناپسند نہیں کرتا بلکہ ہر سیاہ رنگ شے انسان کے لیے کشش سے محروم ہے' چاہے وہ کالے بھجنگ جاندار ہوں یا سیاہ رات۔ سیاہی تمام سفیدی کو نگل لیتی ہے اور ہر شے پر کالا پردہ تان کر اس کے وجود کو اپنا ہم رنگ بنا لیتی ہے۔ تاریکی' خوبی اور خامی کو ڈھانپ کر انفرادیت کو ختم کر دیتی ہے اور ہر شے تاریکی میں اپنے اصل وجود سے ہاتھ دھو بیٹھتی ہے انسان کے اندر بھی سیاہی اور سفیدی کے دونوں عنصر موجود ہیں۔ جس عنصر کی کثرت ہو وہ جلد ہی دوسرے عنصر پر غالب آ جاتا ہے۔ اکثر انسانون کے اندر تاریکی کا مادہ زیادہ ہے جو اندر کی تمام روشنی کو کھانے لگتا ہے اور اگر یہ سلسلہ جاری رہے تو آخر میں انسان کے اندر صرف کالا کوا ہی باقی رہ جاتا ہے۔

رُوبی جعفری

رمُوز

میں نے اپنی چہکار خاموشی سے دفن کردی ہے' اور اب ریگِ نیستاں میں قدموں کے نیچے بہہ رہی ہے۔ میرے اندر کی خاموشی جب رونا چاہتی ہے تو میں بات بے بات قہقہے لگانا شروع کردیتی ہوں اور اس ہنسی کی گونج میں میرے بدن کے خالی کنویں میں سے ایک ندا ابن کر اُبھرنے لگتی ہے۔ ہر عورت اپنی عمر کے چالیسویں سال میں دوبارہ جوان ہو جاتی ہے؛ سو میں نے فیصلہ کیا ہے کہ اپنے اندر کی شریر لڑکی کو نکال باہر پھینکوں کہ ایک دن ویسے بھی تو جوان ہونا ہے' اور مجھے ابھی سے بوڑھا ہونے کی کوئی تمنا نہیں۔

بچپن سے لے کر جوانی تک اور جوانی کے بعد سے بڑھاپے تک کی زندگی' ایک طلسماتی قید ہے اور اس قید کا افسوں اُس وقت ٹوٹتا ہے جب جوانی آہستہ آہستہ غائب ہونے لگتی ہے۔۔۔۔ ایسے میں اپنے اندر کی دنیا کا بوڑھا ہو جانا لازم ٹھہرتا ہے کہ اسی تبدیلی سے گئی جوانی واپس آسکتی ہے۔۔۔۔ اس اندرونی دنیا کو بھی تو آخر زندہ رہنا ہے!

دن کے بعد رات آتی ہے اور رات کا اپنا اسرار ہے۔ رات اپنے ساتھ خواب لاتی ہے۔۔۔۔ سکوتِ شب ہو' آنکھیں بند ہوں' کمرے میں محبوب کے قدموں کی آہٹ اور اُس کے بعد دروازہ بند ہونے کی آواز۔۔۔۔ بس یہی رات کا پہلا راز ہے اور زندگی کا پہلا حسن بھی؛ اور زندگی اپنے طرز میں تغافل کبھی نہیں برتتی۔

آج میرے خال و خد کی عُمر' میرے تجربات اور مشاہدات کی عُمر سے کہیں پیچھے ہے اور میرے اندر کی بوڑھی دُنیا میرا ساتھ چھوڑنے پر آمادہ نہیں۔ وہ کل جو مجھ میں سما گیا ہے۔۔۔۔ اس جہاں میں زندگی کے آغاز کا عمل وہیں سے شروع ہوتا ہے۔۔۔۔ اور وہی اسرار کا حل ہے جو جسدِ خاکی میں داخل ہو کر' رموزِ خاکی تک کو کھنگال ڈالتا ہے۔۔۔۔ ایسے میں ڈھیلی ڈھالی سوچ پر مجھے اپنی گرفت کو مضبوط رکھنا پڑتا ہے۔ میرے تخیل کی آبیاری کے لیے وہ عکسِ کُل تو میری آنکھوں سے عیاں ہے لیکن کوئی خزانۂ زرنگار اِس زمین کی تہہ میں کہیں دفن ہے اور اس آئینے میں میرا ماتمی لباس آج بھی سُرخ ہے!

زندگی کسی طور نچلا نہیں بیٹھ سکتی۔ اگر مجھ پر الزام دھرکے، تمھارے کسی خیال کو توانائی ملتی ہے تو مجھے خوشی ہے کہ میں نے تمھیں حرارت کے نقطۂ انجماد تک پہنچا دیا گو میرے گیسوؤں کی چمک تمھاری ریشمیں نگاہوں کے آگے دُھندلا رہی ہے۔

یہ وقت کی جولانیاں بھی خوب ہیں۔۔۔اِنھیں کسی پل چین نہیں، میری بات تو دھیان سے سنتی ہی نہیں ہیں۔۔۔۔اور تم۔۔۔۔تم بھی اس وقت شرارت کے موڈ میں لگتے ہو۔۔۔۔محض ایک لمسیاتی احساس میں تمھارے مزاج کو بدل کر رکھ دیا ہے! کیا کہا تم نے۔۔۔۔میری آنکھوں کی چمک تمہارا حوصلہ بڑھا رہی ہے!۔۔

ارے، بے دھیانی میں چلنے والے لڑکے سنو۔۔۔اپنے اَطراف میں پھیلی ہوئی کانچ کی بوتلوں کو سمیٹ کر احتیاط سے ایک جگہ رکھ دو۔۔۔اگر یہ غلطی سے ٹوٹ گئیں تو تمھارے پاؤں زخمی ہو جائیں گے۔۔۔۔ہر تخلیق کی آبیاری کے لیے سلاست ابتدا سے انتہا تک کی ایک مشق ہے؛ اُدھڑے قدموں چلتے ہوئے، تم باغ و بہار مناظر کو کیا دیکھ پاؤ گے۔۔۔۔اے سکوتِ شب کی اس مدہم ہوتی روشنی کو میری آنکھوں کی چمک سمجھنے والے۔۔۔میں زندگی کے دشوار گزار راستوں پر ساتھ چلنے کے لیے تمھیں اپنا ہاتھ تھامنے کی اجازت تو دے سکتی ہوں لیکن میرے پاؤں چھونے کی خاطر تم اپنا سر میرے قدموں میں مت رکھ دینا کہ زندگی اپنی تمام تر جولانیوں سمیت دفن ہو چکی ہے اور اب ریگِ نیستاں میرے قدموں کے نیچے ہے!!!

معمر ترین نوجوان

وقت کیا ہے؟ یہ ایک ایسی پہیلی ہے جس کو حل کرنے کے لیے آج تک ہزاروں فلسفی اور دانشور سرگرداں رہے مگر آج تک اس کا کوئی تسلی بخش حل تلاش نہ کر پائے۔ حل تو کیا اس کی جامع اور سب کے لیے قابلِ قبول تعریف بھی بیان نہیں کر پائے۔ اس پہیلی میں کچھ فلسفی تو اتنا الجھ گئے کہ انھوں نے اسے خدا سے تعبیر کر دیا۔ کہ جب کچھ نہیں تھا تو وقت تھا اور جب کچھ نہیں ہوگا تو وقت ہوگا۔ وقت ایک لافانی شے ہے۔ وقت کو شے کہنا بھی غلط ہوگا کیوں کہ وقت کا کوئی مادی وجود ممکن نہیں۔ تو آخر وقت اصل میں کیا ہے؟ کیا یہ ایسے لمحات ہیں جن کو سکون نہیں اور جو انتہائی نپے تلے انداز میں گزر رہے ہیں۔ کیا یہ زمین کی سورج کے گرد اور اپنے محور کے گرد گردش ہے؟ جس میں بال برابر فرق نہیں۔ یا پھر ہماری عمر رواں ہے جو کبھی واپسی کا سفر نہیں کرتی۔ اس کا تسلی بخش جواب آج تک نہیں مل پایا۔ تاہم انسان نے اپنی آسانی کے لیے اور زمانوں میں فرق کرنے کے لیے وقت کو مختلف ٹکڑوں میں تقسیم کر لیا ہے۔ مثلاً سیکنڈ، گھنٹے، دن، ہفتے، مہینے، سال اور صدیاں وغیرہ۔ مثلاً اگر کسی انسان سے پوچھا جائے کہ وہ کب پیدا ہوا تو وہ مثال کے طور پر کہے گا کہ وہ ۱۹۷۰ء میں پیدا ہوا۔ اسی طرح انسان نے دنوں میں فرق کرنے کے لیے ہفتے کو سات دنوں میں تقسیم کیا اور دنوں کے مختلف نام رکھ دیے۔ جو ایک دائرے میں گھومتے رہتے ہیں۔ یہی حال مہینوں کا بھی ہے کہ ایک سال کو ۱۲ مہینوں میں تقسیم کر دیا یہ بھی ایک دائرے میں گھومتے ہیں۔ کیا تھا؟ کہ اگر ہفتہ سات دنوں کی بجائے ۱۲ دن کا اور سال ۱۲ کی بجائے ۷ مہینوں کا بنا دیا جاتا۔ چناں چہ یہ تقسیم انسان نے صرف اپنی آسانی اور پہچان کے لیے کی ہے۔ انسان نے اس قسم کی تقسیم کر کے وقت کو دو وقفوں کے درمیان قید یا محدود کرنے کی کوشش کی ہے جو خود فریبی سے زیادہ کچھ نہیں کیوں کہ وقت کو قید کرنا ناممکن ہے۔ یہ ایک لامحدود حقیقت ہے تاہم یہ تقسیم ایک یاداشت سے زیادہ کچھ نہیں۔

کائنات میں موجود ہر شے کی تخلیق سے پہلے بھی وقت اپنے پورے جاہ و جلال کے ساتھ موجزن تھا اور ہر شے فنا ہونے کے بعد بھی اسی شان و شوکت کے ساتھ جلوہ نما رہے گا۔ چناں چہ وقت

معمر ترین بزرگ ہے جواب تک جوان ہے اور ہمیشہ جوان رہے گا۔ وقت کا محبوب ترین مشغلہ ہر شے کی بساط اُلٹ کر نئی اشیا کی بساط بچھانا اور پھر اس کو اُلٹ کر ایک اور نئی بساط بچھانا اور اسی سلسلے کو لامتناہی طور پر جاری رکھنا ہے۔ ہر چیز سے مفر ممکن ہے، صرف وقت ایک ایسی حقیقت ہے جس سے مفر ممکن نہیں۔

بالحاظِ زمانہ، وقت کو تین حصوں ماضی، حال اور مستقبل میں تقسیم کیا جاتا ہے۔ ماضی سے مراد گزرا ہوا وقت، حال سے مراد موجودہ وقت اور مستقبل جسے فردا بھی کہتے ہیں سے مراد آنے والا وقت ہے۔ تاہم میرے خیال میں جس طرح وقت کی جامع تعریف ممکن نہیں اسی طرح حال کی جامع تعریف بھی ممکن نہیں کیوں کہ لمحے کے کتنے حصے کو حال سے تعبیر کیا جائے یہ ایک حل طلب پہیلی ہے کیوں کہ وقت ہمیشہ چشموں کی طرح رواں دواں رہتا ہے اور آن کی آن میں حال سے ماضی قریب میں تبدیل ہوتا رہتا ہے۔

معمر لوگوں کا احترام کرنا ہماری مشرقی روایت ہے۔ ہم لوگ اپنے بزرگوں کو مغرب والوں کی طرح Old People House میں داخل نہیں کرواتے بلکہ انھیں اپنے پاس رکھ کر ان کی خدمت کو باعث افتخار و فخر سمجھتے ہیں۔ لیکن حیرت کی بات ہے کہ مشرقی لوگ معمر لوگوں کا تو احترام کرتے ہیں لیکن معمر ترین حقیقت یعنی وقت کا بالکل احترام نہیں کرتے اور اس کی قدر و قیمت سے بالکل نا آشنا ہیں۔ جب کہ دوسری طرف اہلِ مغرب اپنے معمر لوگوں کو تو احترام کی نظر سے نہیں دیکھتے لیکن معمر ترین حقیقت یعنی وقت کی قدر و قیمت سے پوری طرح آشنا ہیں اور اس کا کماحقہٗ احترام کرتے ہیں اور اسے ضائع کرنا گناہِ کبیرہ سمجھتے ہیں۔ اسی احترام کی وجہ سے وقت نے بھی ان کا پورا پورا ساتھ دیا ہے۔ اور انھیں وقت کی بلندیوں پر پہنچا دیا ہے۔ اسی احترام کی وجہ سے وقت نے انھیں زمانے کی فرمانروائی سے سرفراز کیا ہے۔ ایک دفعہ کا ذکر ہے کہ ایک مغربی ملک کا باشندہ سیاحت کی غرض سے ایک مشرقی ملک میں آیا۔ اس نے دیکھا کہ ایک آدمی موٹر سائیکل پر سوار انتہائی تیز رفتاری سے جا رہا ہے۔ اسے نہ تو ٹریفک سگنل کا خیال ہے اور نہ ہی بند ریلوے پھاٹک اور آنے والی ٹرین کا۔ یہ دیکھ کر اُس آدمی نے سوچا کہ ہو نہ ہو اس آدمی کو کوئی بہت ضروری کام ہے جس کی وجہ سے یہ اتنی تیز رفتاری سے جا رہا ہے۔ اسے تجسس ہوا اور وہ اس کے پیچھے چل پڑا۔ آگے جا کر دیکھتا ہے کہ وہ شخص موٹر سائیکل ایک طرف کھڑی کر کے، ایک مجمع باز کا تماشا دیکھ رہا ہے۔

ایک محاورہ ہے کہ وقت سدا ایک سا نہیں رہتا۔ میرے خیال میں وقت تو سدا ایک سا ہی رہتا

وقفوں کے درمیان قید نہیں ہے۔ نہ ہی اس کے آغاز کا پتا ہے اور نہ ہی انجام معلوم ہے۔ یہ تو ہمیشہ بہنے والا ایک ایسا دریا ہے جس کے انتہائی سروں کا آج تک سراغ نہیں مل سکا اور نہ ہی آج تک اس کے بہاؤ کی شدت میں کبھی کمی بیشی واقع ہوئی ہے یہ ہمیشہ ایک ہی رفتا کے ساتھ بہتا رہتا ہے اور ہمیشہ بہتا رہے گا۔

اس معمر ترین نوجوان بزرگ کی گود میں پل کر کتنے ہی بچے لڑکپن، جوانی اور بڑھاپے کی سرحدیں عبور کر کے موت سے ہم آغوش ہو گئے لیکن اس بزرگ پر بڑھاپا طاری نہ ہوسکا۔ یہ کمال کا تماش بین واقع ہوا ہے جو ہر ذی روح کی تمام نسلوں کا بساطِ زیست پر رقص، بصد شوق دیکھتا ہے اور لطف اندوز ہوتا ہے۔

وقت ہمیشہ گھومنے والا ایک ایسا ہے جس کو خلا میں حرکت کرنے والے سیاروں اور ستاروں سے تشبیہ دی جا سکتی ہے جس طرح خلا میں کوئی مزاحمتی طاقت نہیں ہوتی جو ان اجرامِ فلکی کی رفتار کو کم کر سکے اسی طرح وقت کی مزاحمت بھی ناممکن ہے اور یہ ہمیشہ ایک ہی رفتار کے ساتھ گھومتا رہتا ہے۔اور اپنے سامنے آنے والی ہر شے کو کچل کر رکھ دیتا ہے۔

وقت ایک ہی لمحے میں کسی ایک شخص کے لیے رحمت اور کسی دوسرے شخص کے لیے زحمت بھی بن سکتا ہے مثلاً ایک کسان کی دعا پر اللہ بارش برسا دیتا ہے عین اس لمحے ایک کمہار کے گیلے برتن جو کھلے آسمان تلے پڑے ہیں وہ ضائع ہو جاتے ہیں اس صورت میں وقت کسان کے لیے رحمت جب کہ کمہار کے لیے زحمت بن جاتا ہے۔ وقت ایک ہی لمحے فاتح اقوام کے لیے رحمت اور مفتوح اقوام کے لیے زحمت ہوتا ہے۔

دنیا میں موجود ہر شے ادھار مل سکتی ہے۔بینکوں کے کارندے قرضہ دینے کے لیے مارے مارے پھرتے ہیں کیا ہی اچھا ہوتا اگر کچھ بینک ایسے بھی کھل جاتے جو وقت ادھار دیتے۔ اگر ایسا ہو جائے تو انسان زندگی کے تمام منصوبوں کی تکمیل کے بعد ہی داعیٔ اجل کو لبیک کہتا اور اسے اپنا کوئی منصوبہ ادھورا چھوڑ کر اس دنیا سے رخصت نہ ہونا پڑتا۔ اپنے چھوٹے چھوٹے بچوں کو یتیم کر کے دنیا کے رحم و کرم پر چھوڑنے کی نوبت نہ آتی۔ لیکن اگر ایسا ہو بھی جائے تو شاید ہم جیسے غریب لوگوں کو یہ ادھار نہ مل پائے اور اعلیٰ درجے کے لوگ ہی اس سے فائدہ اٹھائیں گے اور شاید یہ لوگ پھر کبھی مریں ہی نا۔ جوں ہی موت قریب آتی نظر آئے گی یہ لوگ فوراً ان بینکوں سے تازہ قرضہ پاس کروالیں گے اور پھر

اپنے قرضے ری شیڈول (reshedule) بھی کرواتے رہیں گے۔لیکن پریشانی کی بات یہ ہے کہ اگرا یسے قرضے ملنے بھی شروع ہو جائیں تو ان کی واپسی کی کیا صورت ہوگی کیا اصل اور سود کی مد میں وقت ہی واپس کرنا پڑے گا اگر ایسا ہے تب بھی ان اعلیٰ لوگوں کی چاندی ہوگی کیوں کہ قرضہ تو وہ لیں گے اور اس کی واپسی کا بوجھ ہم جیسے غریب طبقے پر پڑے گا۔جس کی حالت مزید پتلی ہو جائے گی۔

کہتے ہیں وقت سب سے بڑا معلم ہے اس بات کی حقانیت سے کوئی انکار نہیں کر سکتا۔کیوں کہ یہ وقت ہی ہے جو انسان کو مختلف ہنر سکھاتا ہے اور اسے جہان میں اوجِ کمال تک پہنچاتا ہے۔ایک بچہ جس وقت جنم لیتا ہے تو اس کی حیثیت ایک خام مال سے بڑھ کر کچھ نہیں ہوتی یہ وقت کے تھپیڑے ہی ہوتے ہیں جو اسے مکینک ،ڈاکٹر ،انجینئر ، بزنس مین ،سائنسدان وغیرہ بنا دیتے ہیں ۔اور وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ وہ اپنی متعلقہ فیلڈ میں اس قدر ماہر ہو جاتا ہے کہ لوگ اس کی مثال دیتے ہیں ۔ یہ وقت ہی ہے جس نے انسان کو زمین کے سینہ سے اُٹھا کر چاند سے ہم آغوش کیا اور سائنس کی تمام ایجادات بھی وقت ہی کی مرہون منت ہیں ۔ وقت نے ہی انسان کی دنیا کی فرمانروائی کے اصول سکھائے ۔تہذیبوں کا ٹکراؤ، کہیں تہذیبوں کا ناپید ہونا اور نئی تہذیبوں کا جنم لینا بھی وقت ہی کے مرہونِ منت ہے۔

ہر ذی روح وقت کے قفس کا قیدی ہے ۔ وقت اچھا ہو یا برا، اس کا احترام بہت ضروری ہے کیوں کہ اس بزرگ کا انتقام شدید ہوتا ہے اور کسی کو لمحہ بھر کی بھی مہلت نہیں دیتا۔

☆☆☆☆

ظہیر عباس

گھڑی

گھڑی دُنیا و مافیہا سے بے خبر، مسلسل چکر پہ چکر کاٹ رہی ہے۔ یہ خود تو دوری حرکت کرتی ہے لیکن وقت کو مستقیم خطوط پر گامزن رکھتی ہے۔

گھڑی کا اور میرا رشتہ سُر اور تال کی طرح کا ہے۔ جس طرح مخصوص تال سے گائیک کے سُر ملنے پر آسماں سے مینہ برس سکتا ہے، شیشہ کرچوں میں بٹ سکتا ہے، اُسی طرح گھڑی کے قدموں سے میرے قدم ملنے پر دُنیا کے سارے طلسم ٹوٹ سکتے ہیں۔ مانا کہ اس کی ہم قدمی میرے بس میں نہیں اور شاید میرے اور دُنیا کے حق میں بھی نہیں، دُنیا کے سارے طلسم اگر ٹوٹ گئے تو یہ بہت بے رنگ اور بے رونق ہو جائے گی لیکن اس کی رفاقت تو بہر حال ممکن ہے اور اس کی بدولت میں دُنیا میں اپنی حیثیت اور مقام کا اندازہ لگا کر کچھ پیش رفت کرتا رہتا ہوں۔ تاہم ایسا بھی نہیں کہ میں ہر وقت اس کی رفاقت کا طالب رہوں؛ بعض اوقات اس سے بے زار بھی ہو جاتا ہوں۔

جب میں وقت کی قید سے آزاد ہونا چاہتا ہوں، گھڑی کو اپنی کلائی سے اُتار پھینکتا ہوں، لیکن وقت نہیں رُکتا؛ گھڑی سے اس کی اس قدر بے نیازی کے باوجود مجھے یہ دونوں ایک مضبوط بندھن میں بندھے نظر آتے ہیں۔ کیا یہ نہیں کہا جا سکتا کہ گھڑی، وقت کا لباس ہے جس نے اس کی ''روحانیت'' کو مادّی ڈھانچا مہیا کیا ہے! کچھ احباب کی رائے میں گھڑی سے آزاد وقت، تیز تلوار کے مانند ہے جو اچانک وار کرتا ہے اور لمحہ بھر میں کام کر جاتا ہے لیکن گھڑی کی صورت میں یہ ایک کُند چھری کی طرح ہے اور ہر لمحے اپنے وار کا احساس دلاتا ہے۔ وقت سے گھڑی تک کا سفر بھی انسان کے تخلیقی عمل سے مشابہت رکھتا ہے جس میں خیال، تجریدی حالت سے تجسیم کی صورت میں قرطاس پر منقش ہوتا ہے۔ وقت بھی گھڑی کی ایجاد سے قبل ایک ''آوارہ خیال'' تھا جسے انسان نے گھڑی کی صورت مجسم کر دیا۔ وقت سے گھڑی کے اس سفر کو ''رقص'' کے مشابہ بھی کہا جا سکتا ہے جس میں خیال کو جسم کی زبان میں ڈھالا جاتا ہے۔

انسان اپنے مادّی وجود کے باعث ہمیشہ احساسِ کمتری میں مبتلا رہا ہے جس سے خود کو باہر

نکالنے کے لیے ہی شاید اس نے وقت کو گھڑی کی ''مادّی'' صورت دی ہے اور یوں ثابت کر دکھایا ہے کہ وہ بھی تخلیق کرنے کی اہلیت رکھتا ہے۔ بہر حال یہ جیسے بھی ممکن ہوا' وقت سے گھڑی تک کا سفر انسان کی بڑی کامیابی ہے۔

گھڑی متعین شدہ راہوں سے گزر جانے کی بے قراری میں لمحۂ موجود سے فرار چاہتی ہے کہ شاید آنے والے لمحوں کو گرفت میں لے سکے لیکن اس دوڑ دھوپ میں لمحۂ موجود سے بھی ہاتھ دھو بیٹھتی ہے۔ اگر یہ میری صلاح لیتی تو میں اسے ماضی کو حاصل بنا لینے کا مشورہ دیتا' جو جیسا بھی تھا' اس کا اپنا تو تھا! ویسے بھی یہ آنے والے لمحے کو گرفت میں لینے کی سعی کر رہی ہے' وہ بھی درحقیقت ماضی ہی ہونے والا ہے' ماضی کا احساس بھی شاید اِسی لیے بہت گہرا ہوتا ہے۔ پھر غور کرتا ہوں تو اپنی یہ بات بھی مجھے غلط نظر آتی ہے کہ گھڑی کا ناتا' لمحۂ موجود سے ٹوٹ جائے تو ماضی اور مستقبل کا وجود ہی منہدم ہونے لگتا ہے۔ خیر! اس میں قصور میرا بھی نہیں' انسان وقت کے سامنے محض بے بس اور مجبور ہے جو انسان کے خیالات کو مسلسل تبدیل کرتا رہتا ہے۔ شاید اسی مقام پر' جب انسان کی اپنی تخلیق بھی اس کے بس میں نہیں رہتی تو اُسے ''صدائے کن'' پر ایمان لانا پڑتا ہے۔

غالبًا انسان کے دل کی دھڑکن نے اسے گھڑی ایجاد کرنے کی ترغیب دی ہے' جو بے قراری میں اسے وقت سے بھی آگے نکل جانے پر مائل کر رہی ہے' لیکن انسان کلائی کی گھڑی کی طرح اپنے اندر کی اس گھڑی سے بھی نجات چاہتا ہے جو پانی، مٹی اور آگ میں جکڑی ہوتی ہے۔۔۔۔ ان میں پانی انسان کا ماضی ہے، مٹی لمحۂ موجود اور آگ اس کا مستقبل!

☆☆☆☆

فاطمہ بتول

رنگ

''رنگ'' اور ''لفظ'' دیکھنے اور سننے ہی میں نہیں' ہیئت اور حیثیت میں بھی دو مختلف چیزیں ہیں؛ لیکن غور کیا جائے تو دونوں میں کوئی خاص فرق بھی نہیں۔ رنگ' کائنات میں ہر جگہ بکھرے پڑے ہیں۔ انسانوں' حیوانوں میں' نباتات اور جمادات میں ہر جگہ رنگ ہی رنگ ہیں۔ اگر یہ کسی مصور کی تحویل میں آ جائیں تو بے جاں خطوط اور قوسیں بھی بولنے لگتی ہیں' کائنات میں بکھر جائیں تو اللہ کی قدرت بن جاتے ہیں اور چہرے پر آ جائیں تو جذبات و احساسات شیر و شکر ہو جاتے ہیں۔۔ تینوں صورتوں میں ان کا کام منظر کی تجسیم ہے۔

الفاظ کی کہانی بھی رنگوں سے کچھ مختلف نہیں۔ ہمارے ذہنوں اور زبانوں پر ہر لحہ بے شمار الفاظ ہوتے ہیں۔ اگر انھیں کسی شاعر یا ادیب کا قلم چھو لے تو یہ اپنی معراج پر پہنچ جاتے ہیں اور ادبی شہ پارے منصۂ شہود پر آ جاتے ہیں جب کہ عام آدمی کے لیے یہ صرف باتیں ہیں۔

ادب اور مصوری کا آپس میں گہرا تعلق ہے۔ مصور رنگوں سے تصویر کشی کرتا ہے اور ادیب لفظوں سے۔ دونوں کی بنائی ہوئی تصویریں مختلف شعبہ ہائے زندگی کی نمائندگی کرتی ہیں۔

کائنات میں سب سے زیادہ شرفِ قبولیت' میرے خیال میں' رنگ کے حصے میں آیا ہے۔ وہ اس لیے کہ رنگ' زماں و مکاں کی قید سے آزاد ہے۔ رنگ کا انتخاب کرنے سے پہلے کوئی یہ نہیں سوچتا کہ یہ شدت پسند ہے یا روشن خیال۔۔۔ اس کا تعلق کس ملک، کس طبقے، کس مذہب اور کس فرقے سے ہے۔ شاید یوں کہنا بہتر ہوگا کہ رنگوں کا پنا ہی ایک نظام ہے جس میں سب انسان برابر ہیں' گورے کو کالے پر اور عربی کو عجمی پر فوقیت حاصل نہیں۔ فطرت کے رنگ سب کے لیے ہیں۔ قدرت بلا تخصیص اپنے رنگ ہم پر نچھاور کرتی ہے۔ موسموں کا تغیر اور دن رات کی گردش بنیادی طور پر رنگوں کی تبدیلی کا نام ہے۔

رنگوں کی زبان کائناتی ہے جسے سمجھنے کے لیے کسی اعلیٰ ڈگری کی ضرورت ہے نہ لسانی سرٹیفکیٹ کی۔۔۔ یہ سب اضافی چیزیں ہیں محض خود فریبی ہے۔۔۔ شوق بس ایسی چیز ہے جو رنگوں سے لطف اندوز

بدلتے آسمان سے لے کر سردی سے نیلے پڑتے ناخنوں تک اور دیوسائی کے میدان میں بکھرے پھولوں سے لے کر جوشاندے کی سوکھی جڑی بوٹیوں تک کے رنگ اپنے اندر پوری کائنات سمیٹے ہوئے ہیں۔

میرا دل چاہتا ہے کہ سب رنگ اس طرح میری ذات کا حصہ بن جائیں کہ میرا ہر ہر عضو ایک ایک رنگ ہو، ہر رنگ کی ایک زبان ہو۔۔۔وہ زبان کہ جو کائناتی ہو، جو لفظوں کی متقاضی نہ ہو!!

☆☆☆☆

ڈاکٹر محمد سلیم ملک

تالیاں

پتا نہیں یہ تقریر کرنے والوں کی خوبی ہے یا خرابی کہ انھیں سننے والے ہر طرح کے مل جاتے ہیں۔''ان میں کامل بھی ہیں، غافل بھی ہیں، ہشیار بھی ہیں''۔ باراں دیدہ حاضرین بھی ہوتے ہیں جو جلسے میں حاضری لگوانے آتے ہیں اور پہلی قطار میں جا بیٹھتے ہیں تا کہ معززینِ شہر سے سلام دعا کر لیں، صاحب صدر کی نظروں میں آئیں اور مہمان خصوصی کو منہ دکھائیں۔ ان میں ناظرین بھی ہوتے ہیں جس کا مطلب یہ نہیں کہ اُنھیں نظر زیادہ آتا ہے بلکہ وہ اپنی آنکھوں پر سیاہ چشمہ چڑھاتے ہیں تا کہ یہ پتا ہی نہ چلے کہ وہ کسے دیکھ رہے ہیں! ادھر لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ وہ پریس والوں کو دیکھ رہے ہیں اور اُدھر وہ خواتین کو تاڑ رہے ہوتے ہیں۔ یہ ناظرین کی ترقی یافتہ قسم ہے جسے نظریاتی ناظرین بھی کہہ سکتے ہیں جب کہ سامعین بڑے سادہ دل ہوتے ہیں وہ ہماری اور آپ کی طرح بڑی بے بسی سے دیکھتے ہیں، جیسے مقرر سننے والوں کو اُس وقت دیکھتا ہے جب اُس کی ہوٹنگ ہو رہی ہو۔ حاضرین، ناظرین اور سامعین کی بانہیں گلے میں ملتی ہیں تو پنڈال کی تکون بنتی ہے جس میں تقریر کرنے والا عمودی انداز میں کھڑا اپنی کہانی سناتا ہے۔ اس کے بولنے اور نہ بولنے کے وقفوں میں تالیاں بجتی ہیں۔ تالیاں، سامعین کا شائستہ احتجاج ہوتی ہیں اور دونوں طرح کا کام دیتی ہیں، یعنی کبھی ''مرحبا'' اور کبھی ''مر گیا'' کی تصویر بناتی ہیں۔ یہ تالی بجانے والے پر منحصر ہے کہ وہ اس سے کیا کام لیتا ہے۔ جیسے چھری، جراح کے ہاتھ میں ہو تو مریض کو زندگی دیتی ہے اور قسائی کے ہاتھ آ جائے تو بکرے کو موت کے گھاٹ اُتار دیتی ہے۔ اسی طرح ہمیں یہ دیکھنا چاہیے کہ تالیاں اس وقت کس کے ہاتھ میں ہیں اور وہ ان سے کیا کام لے رہا ہے۔ ہمیں تالیوں کی سمت، تکرار اور شدت پر نہیں پھولنا چاہیے بلکہ تالی کی اچھائی برائی کو بھی پرکھنا چاہیے۔ اس کے لیے تالی بجانے والے کو دیکھیں، تالی ساز ہاتھوں کے ارادے بھانپیں اور ان ارادوں میں چھپی نیت تک پہنچیں۔

بعض تالیاں ابھرتی بڑے جوش و خروش سے ہیں مگر ان کا تعلق تقریر سے نہیں ہوتا۔ یہ کسی

غرض وغایت سے بے نیاز رہتی ہیں اور اپنی ایک خاص ادا اور شانِ محبوبی رکھتی ہیں۔ یہ ہوتی تو مقرر سے بے تعلق ہیں مگر مقرر اپنی خوش گمانی میں یہ سمجھتا ہے کہ یہ میرا دل بڑھا رہی ہیں، میری آواز کو ساز دے رہی ہیں۔ اس لیے اس کی تقریر کا سیلابی ریلا تالیوں کے حفاظتی بند سے بار بار ٹکراتا ہے اور جب اس کی تقریر بند کے خطرناک نشان کو چھونے سے پہلے پُل سے گزر جاتی ہے تو وہ فاتحانہ انداز سے ڈائس سے اترتا ہے، کسی پر مسکراتا اور کسی پر سلام بھیجتا ہے، سامعین کی صفوں سے گزرتا ہوا اپنی نشست پر جا بیٹھتا ہے اور اگر تالیاں ابھی تک پھڑ پھڑا رہی ہوں تو وہ خود بھی ہاتھ اٹھا کر تالیاں بجانے لگتا ہے۔

کچھ تالیاں بے وقت راگنی کی طرح ہوتی ہیں۔ ان کا سر پیر کوئی نہیں ہوتا۔ بس یہ اپنا جواز آپ ہوتی ہیں۔ تقریر کی بوچھاڑ میں خودرو جھاڑیوں کی طرح اُگ پڑتی ہیں۔ ہال کے کسی حصے سے ایک دم ابھرتی ہیں اور اپنے پیچھے بہت سا شور چھوڑ جاتی ہیں۔ ان تالیوں کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ ایوان کی خاموشی توڑ دی جائے۔ یہ توانا جذبوں کو بے ساختہ چھلکاتی ہیں اور حریفوں کو اپنے ہونے کی اطلاع دیتی ہیں۔ اس لیے ایوان کے دوسرے سرے سے ان کا جواب آتا ہے اور تالیوں کا ویسا ہی شور اُٹھ کھڑا ہوتا ہے جو بڑی بدنظمی سے کہیں جا بیٹھتا ہے۔

تالیوں کی روایتی قسم اُس وقت دیکھنے میں آتی ہے جب مقرر اپنی رٹی ہوئی تقریر بھول جاتا ہے۔ جب تقریر کرنے والا گھبرا جاتا ہے، گڑبڑا جاتا ہے، لڑکھڑا جاتا ہے یا مجنوں جیسی شکل کے مقرر کی ٹانگیں بیدِ مجنوں کی طرح کانپنے لگتی ہیں تو تالیوں کی پالیاں ابھرنے، گونجنے اور چکر کھانے لگتی ہیں اور اگر مقرر سخت جان واقع ہوا ہو اور ہانپنے اور کانپنے کے باوجود تقریر کی رسی نہ چھوڑے تو تالیاں اس کے ساتھ چل پڑتی ہیں۔ جب صورت یہ پیدا ہو جائے تو سامعین، مقرر کی زبان سے محفوظ نہیں ہوتے اور مقرر، سامعین کے ہاتھوں سے محفوظ نہیں ہوتے۔ تقریر اور تالیوں میں رسہ کشی شروع ہو جاتی ہے۔ مقرر کی آواز رہ رہ کر ابھرتی ہے اور تالیاں اسے تھپک تھپک کر سلاتی ہیں اور جس طرح لاتوں کے بھوت باتوں سے نہیں مانتے اُسی طرح مقرر کی زبان درازی کو بھی سامعین کی دست درازی چپ کراتی ہے اور آخر تالیاں مقرر کی آواز کا گلا گھونٹ دیتی ہیں۔

بعض ہوشیار مقرر تالی گروں کا ٹولا اپنے ہمراہ لاتے ہیں اور اس ثقافتی طائفے کو سامعین میں لا بٹھاتے ہیں۔ پھر جب وہ تقریر کرنے ڈائس کی طرف بڑھتے ہیں تو یہ ٹولا حقِ نمک اس طرح ادا کرتا ہے جیسے انھیں اپنی تالیوں کا ''گارڈ آف آنر'' پیش کر رہا ہو۔ اس کے ساتھ ہی وہ ایک آدھ نعرہ مستانہ، لمبی

سی والہانہ ''ہائے'' یا ایسا کوئی اور ہنکارا بھی بھرتے ہیں۔ اُدھر مقرر ہے کہ ہنستا اور مسکراتا ہوا، کرسیوں سے بچتا اور لوگوں سے ٹکراتا ہوا، ہاتھوں کے اشاروں اور سر کی جنبشوں سے سلام کرتا ہوا، ڈائس پر چڑھ جاتا ہے مگر جب وہ غنچہ دہن تقریر کے گل کھلاتا ہے تو شرمندگی کی ایک نئی کہانی جنم لیتی ہے چناں چہ وہ تالیاں جو ابھی اس کا سواگت کر رہی تھیں شرمندہ ہو کر چپ سادھ لیتی ہیں اور ان کی جگہ نئی تالیاں ہونگ کے کنکر اچھالنے لگتی ہیں۔ ناچار مقرر، ان تالیوں کی بوچھاڑ میں بھیگتا ہوا پنی نشست پر جا گرتا ہے۔ اس وقت طرح طرح کی تالیاں دیکھنے میں آتی ہیں۔ نئی تالیاں، پرانی تالیاں، چھوٹی تالیاں، بڑی تالیاں، سریلی تالیاں، بے سری تالیاں، سڈول تالیاں، بے ڈول تالیاں، بے باک تالیاں، بے حجاب تالیاں، لچک دار تالیاں، خوشبودار تالیاں، غرض اتنی تالیاں ہوتی ہیں کہ سمجھ میں نہیں آتا، آیا کون سی تالیاں رکھ لی جائیں اور کتنی تالیاں چھوڑ دی جائیں! ان سب تالیوں میں مجھے وہ تالی سب سے اچھی لگتی ہے جو سب تالیوں میں رہ کر بھی ان سب سے جدا ہوتی ہے۔۔۔ آڑی آڑی سی، اونچی اونچی سی، کھرج کی آواز میں، تیور کے سُر میں! سب تالیاں جب واپس آ رہی ہوتی ہیں تو یہ تالی ابھی جا رہی ہوتی ہے اور سب تالیاں جب چپ سادھ لیتی ہیں تو یہ تالی کچھ دیر اور بجتی رہتی ہے۔۔۔ یوں لگتا ہے، جیسے ایک ہاتھ سے بج رہی ہو، اور معدوم پڑنے سے پہلے اونچی سی دھمک چھوڑ جاتی ہے!

☆☆☆☆

کتابیات

۱۔ دنیا خوبصورت ہے، ڈاکٹر وزیر آغا، انشائی کلیات ''پگڈنڈی سے روڈ رولر تک'' ۱۹۹۵۔
۲۔ بے خوابی، غلام جیلانی اصغر، اوراق، اگست۔ستمبر ۱۹۹۵۔
۳۔ مکالمہ، جمیل آذر، اوراق، نومبر۔دسمبر ۲۰۰۵۔
۴۔ درمیان کی دیوار، ڈاکٹر انور سدید، اوراق، جون۔جولائی ۱۹۹۲۔
۵۔ کھڑکی، حامد برگی، انشائی مجموعہ ''بانداز دگر'' ۱۹۹۳۔
۶۔ گرہ، ڈاکٹر سلیم آغا قزلباش، کاغذی پیرہن، نومبر۔دسمبر ۲۰۰۹۔
۷۔ مُسکراہٹ، ڈاکٹر رشید احمد گوریجہ، اوراق، جولائی۔اگست ۱۹۹۴۔
۸۔ نادانی، انجم نیازی، کاغذی پیرہن، نومبر۔دسمبر ۲۰۱۳۔
۹۔ ایک دروازہ، شہزاد احمد، اوراق، مئی۔جون ۱۹۹۳۔
۱۰۔ بزرگی، خیرالدین انصاری، اوراق، جولائی۔اگست ۱۹۹۴۔
۱۱۔ خوشامد، ڈاکٹر حسرت کاسگنجوی، اوراق، اگست۔ستمبر ۱۹۹۵۔
۱۲۔ میں کہاں ہوں، اکبر حمیدی، اوراق، مارچ۔اپریل ۲۰۰۴۔
۱۳۔ خوشی، عذرا اصغر، اوراق، جنوری۔فروری ۱۹۹۶۔
۱۴۔ لکیر، خالد صدیقی، اوراق، دسمبر ۱۹۹۱۔
۱۵۔ میرا گھر، حنیف باوا، اِنشائی مجموعہ ''دائروں سے باہر'' ۲۰۰۷۔
۱۶۔ کائنات بوڑھی نہیں ہوتی، ڈاکٹر ناصر عباس نیر، کاغذی پیرہن، جولائی۔اگست ۲۰۰۱۔
۱۷۔ بولتے سناٹے، پروین طارق، کاغذی پیرہن، مئی۔جون ۲۰۰۱۔

۱۸۔ دُھند میں سفر شروع ہوا، ڈاکٹر منور عُثمانی، اِنشائی مجموعہ ''فرنٹ سیٹ'' ۲۰۱۰ء۔
۱۹۔ برگد، شفیع ہمدم، اِنشائی مجموعہ ''رعنائی خیال'' ۲۰۰۵ء۔
۲۰۔ لامکانی لازمانی، مشتاق احمد، اوراق، نومبر۔دسمبر ۲۰۰۵ء۔
۲۱۔ بیزاری، محمد اِسلام تبسم، اوراق، دسمبر ۱۹۹۱ء۔
۲۲۔ اشارے، شاہد شیدائی، اوراق، مارچ۔اپریل ۲۰۰۴ء۔
۲۳۔ چاندنی رات، عبدالقیوم، کاغذی پیرہن، جنوری۔فروری ۲۰۱۶ء۔
۲۴۔ کروٹ لینا، جاوید اصغر، کاغذی پیرہن، مئی۔جون ۲۰۰۱ء۔
۲۵۔ بُک شیلف، صفدر رضا صفی، اوراق، جولائی۔اگست ۱۹۹۴ء۔
۲۶۔ تعاقب، بصیر رضا، کاغذی پیرہن، ستمبر۔اکتوبر ۲۰۰۱ء۔
۲۷۔ لوری، محمد عامر رانا، اوراق، جنوری۔فروری ۱۹۹۶ء۔
۲۸۔ دائرہ، ڈاکٹر نعیم احمد، اوراق، جولائی۔اگست ۱۹۹۷ء۔
۲۹۔ گنگنانا، جاوید حیدر جوئیہ، اوراق، جنوری۔فروری ۱۹۹۹ء۔
۳۰۔ مرتا ہوں خامشی پر، مختار پارس، اوراق، جولائی۔اگست ۱۹۹۷ء۔
۳۱۔ تعارف، ڈاکٹر محبوب عالم، اوراقِ ادب، نومبر۔دسمبر ۲۰۱۶ء۔
۳۲۔ بیل گاڑی، سیّد تحسین گیلانی، اوراق، نومبر۔دسمبر ۲۰۰۵ء۔
۳۳۔ تیز رفتاری، عامر عبداللہ، کاغذی پیرہن، مارچ۔اپریل ۲۰۰۲ء۔
۳۴۔ کالا کوّا، ساجدہ نواز، اوراق، مئی۔جون ۲۰۰۲ء۔
۳۵۔ رُموز، رُوبی جعفری، کاغذی پیرہن، ستمبر۔اکتوبر ۲۰۱۱ء۔
۳۵۔ معمّر ترین نوجوان، انتظار باقی، نالۂ دل، اکتوبر۔دسمبر ۲۰۱۴ء۔
۳۷۔ گھڑی، ظہیر عباس، کاغذی پیرہن، نومبر۔دسمبر ۲۰۰۵ء۔
۳۸۔ رنگ، فاطمہ بتول، کاغذی پیرہن، جولائی۔اگست ۲۰۱۰ء۔
۳۹۔ تالیاں، ڈاکٹر محمد سلیم ملک، کاغذی پیرہن، ستمبر۔اکتوبر ۲۰۰۱ء۔

☆☆☆☆